صحیفہ

غالب نمبر

جولائی ۱۹۶۹ ع

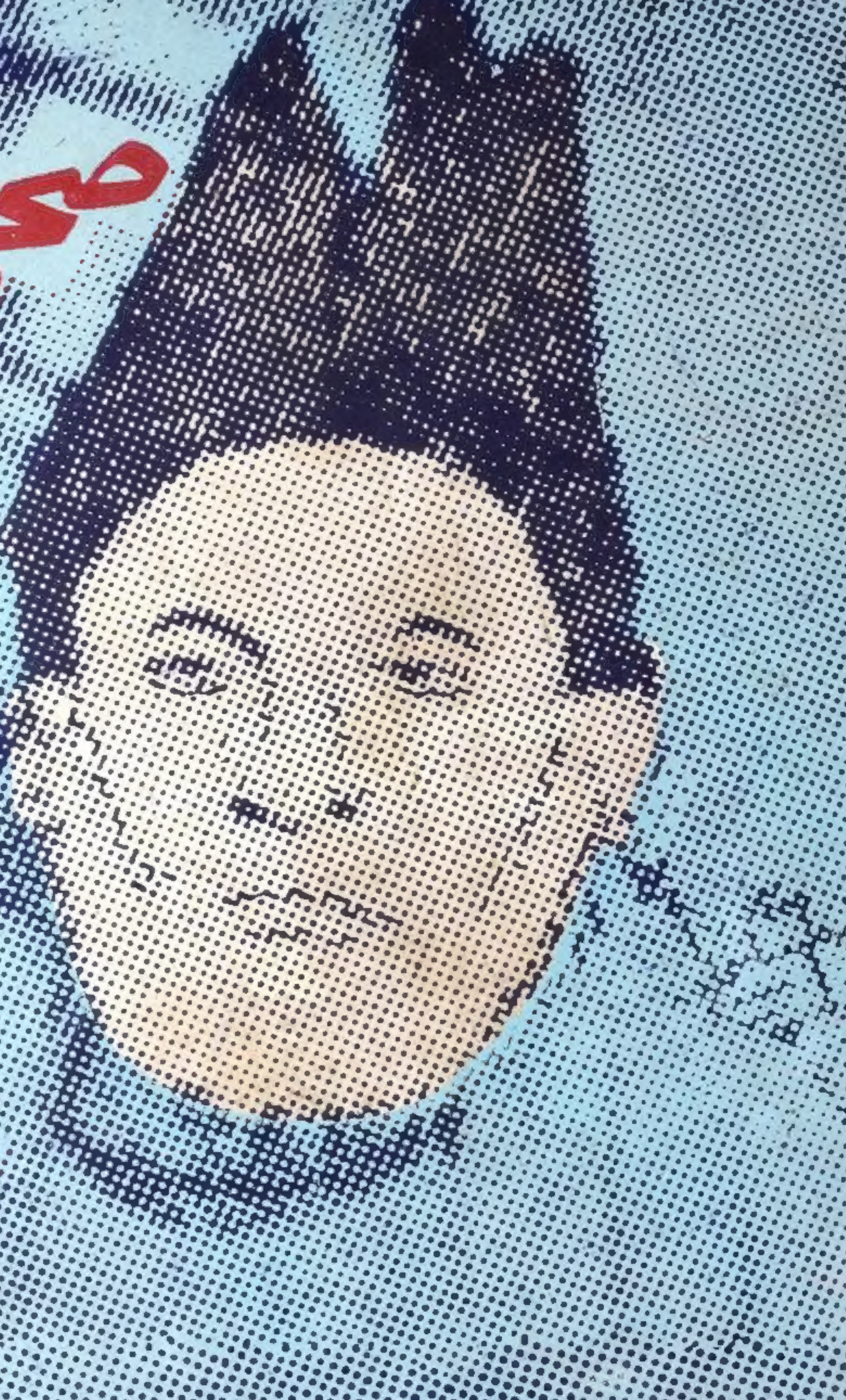

مرتب

ڈاکٹر وحید قریشی

اڑتالیسواں شمارہ

جولائی ، ۱۹۶۹ع

صحیفہ

غالب نمبر

(حصہ سوم)

مدیر اعزازی : ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر معاون : کلب علی خاں فائق

محکمۂ تعلیم مغربی پاکستان نے جملہ مدارس کے لیے بذریعہ
سرکار جی/۲۲۹۲۹ منظور کیا
افواج پاکستان کی یونٹ لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ناظم : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
مجلس ترقیِ ادب ، ۲- کلب روڈ ، لاہور
ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
طابع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

سالانہ چندہ
فی پرچہ

فہرست مضامین

مولانا امتیاز علی عرشی :

نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں (نسخۂ بھوپال کی روشنی میں) - ۱ تا ۲۸

ڈاکٹر سید حامد حسین :

دیوان غالب (نسخۂ بھوپال) پر ثبت دستخط اور مہریں - - ۲۹ تا ۳۹

مشفق خواجہ :

غالب اور صفیر بلگرامی (قسط اول) - - - - - - - ۴۰ تا ۷۲

محمد ایوب قادری :

غالب اور مارہرہ - - - - - - - - - - - - ۷۳ تا ۹۰

اسرار الحق :

غالب کا ایک خط اور ناظم سے منسوب غزل - - - - - ۹۱ تا ۹۳

ڈاکٹر خلیق انجم :

غالب کے دو جعلی شاگرد اور ایک جعلی تحریر - - - - ۹۴ تا ۱۰۷

ڈاکٹر شوکت سبزواری :

غالب اور اصول لغت نگاری - - - - - - - - - ۱۰۸ تا ۱۲۹

یوسف جمال انصاری :

کلام غالب میں طنز و ظرافت (آخری قسط) - - - - - ۱۳۰ تا ۱۳۲

مجلس کی کارگزاری - - - - - - - - - - - -

اشتہارات - - - - - - - - - - - - -

صحیفہ

غالب نمبر (حصہ چہارم)

صحیفے کا آئندہ شمارہ بھی غالب نمبر ہوگا

اس شمارے میں

مندرجہ ذیل مقالہ نگار حصہ لے رہے ہیں :

مشفق خواجہ	ایم اسلم
ڈاکٹر محمد باقر	علی سردار جعفری
حسن زیتون عمر	سخاوت مرزا
ڈاکٹر لئیق احمد بابری	نادم سیتاپوری
عبداللہ قریشی	ڈاکٹر گیان چند
ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	مرزا ادیب
شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	فتح محمد ملک
سید معین الرحمان	سید امتیاز علی تاج
ڈاکٹر عابد رضا بیدار	منظور احسن عباسی
عشرت رحمانی	عبدالرزاق چوہدری
صوفی اے کیو نیاز	افسر صدیقی امروہوی

ناظم مجلس ترقی ادب - کلب روڈ - لاہور

مولانا امتیاز علی عرشی

نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں

(نسخۂ بھوپال کی روشنی میں)

مرزا غالب نے اپنا منتخب دیوانِ ریختہ مرتّب کر کے خارج اشعار کے متعلق دیباچے میں حسبِ ذیل الفاظ لکھے تھے :

''امید کہ سخن سرایانِ سخنور ستائی ، پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازین اوراق یابند ، از آثارِ تراوشِ رگِ کلکِ این نامہ سیاہ نہ شناسند و چامہ گرد آور را در ستایش و نکوہشِ آن اشعار ممنون و ماخوذ نہ سگالند ۔''

لیکن اُن کی اس ہدایت کے باوجود جب ملک میں نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا اور مرزا صاحب کے دیوانِ قدیم کے نظری اشعار اہل ذوق کے سامنے لائے گئے تو اُن کی عمومی بے لطفی کے باوجود اس اکتشاف کو بہت بڑا ادبی کارنامہ تسلیم کیا گیا ۔
فی الحقیقت ریاست بھوپال کے ''کتاب خانۂ حمیدیہ'' کا یہ شرف لائقِ صد تحسین و آفرین ہے کہ اُس نے اس مجموعے کو عرصۂ دراز تک محفوظ رکھا ، ورنہ آج اس عدیم المثال شاعر کی تدریجی ترقی کا مطالعہ ناممکن تھا ۔ اور ریاست بھوپال مستحقِ تبریک ہے کہ اُس نے مفتی انوار الحق صاحب ایم اے مرحوم ، خلف مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی مرحوم کو اس کی ترتیب کا ذمہ دار قرار دیا ۔ مفتی صاحب جدید اصولِ ترتیب سے بڑی حد تک واقف تھے ۔ انھوں نے اس کام کو محنت سے انجام دیتے ہوئے ترتیب کا اچھوتا مگر قدرے مشکل انداز اختیار کیا ۔ لیکن وہ ریاست کے اعلیٰ عہدیدار تھے اور بہر حال اُس عہدے کے فرائض اہم اور زیادہ توجہ کے مستحق تھے ، اس بنا پر ہمہ تن محقق و مفتش کا سا کام نہ کر سکے اور چھوٹی بڑی کوتاہیاں راہ پا گئیں ۔

مجھے عرصے سے دیوان غالب اردو کے نسخوں میں اس سب سے قدیم اور اہم نسخے کی زیارت کا شوق تھا ۔ خوش قسمتی سے کل ہند انجمن ترقی اردو کے اجلاسِ ناگپور منعقدہ ۱۹-۲۰-۲۱ جنوری ۱۹۴۴ع سے واپسی میں دو روز بھوپال میں

قیام کا موقع مل گیا ۔ اس بہانے سے میں نے نسخۂ بھوپال یعنی نسخۂ حمیدیہ کے اصل کی زیارت اور اصل و نقل کا مقابلہ کرنے کا کچھ وقت نکال لیا ۔ اس مختصر سے وقت میں جو کچھ نوٹ میں نے لے لیے تھے ، انھیں نسخۂ عرشی کے دیباچے اور حواشی میں پیش کر چکا ہوں ۔ لیکن نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے ان یادداشتوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے ۔ اس لیے علیحدہ مضمون کی شکل میں یکجا پیش کرنا مناسب جانتا ہوں ، تاکہ وہ حضرات جن کے پاس نسخۂ حمیدیہ ہے ، اپنے اپنے نسخوں میں تصحیح و اضافہ کر سکیں ۔ پہلے اس گم شدہ متاعِ بے بہا کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے ۔

اس مخطوطے کا ناپ $\frac{۲۹ \times ۲۲}{۸}$ اور کاغذ عمدہ کشمیری ہے ۔ جدولیں رنگین اور طلائی اور باریکا لاجوردی ہے ۔ روشنائی سیاہ اور عنوانات شنجرفی ہیں ۔

شروع میں فوج دار محمد خاں بہادر[1] کی مُہر ہے جس میں ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ع) منقوش ہے ۔ ابتدائی سادہ اوراق میں سے پہلے دو ورقوں پر جو کھردرے کاغذ کے ہیں ، وہ فارسی غیر منقوط خط نقل کیا گیا ہے جو میرزا صاحب نے مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم کو لکھا تھا[2] ۔ ان دونوں ورقوں کے بعد دو اور انگریزی کاغذ کے ورق ہیں جن میں سے پہلے کے رخ 'ب' میں شمسے کے اندر لکھا ہے :

"دیوان ہذا من تصنیف میرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد ۔ از کتب خانۂ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوج دار محمد خاں بہادر دام اقبالہ' ، قلمی ، خوش خط ۔"

دوسرے ورق کے رخ الف میں شمسے کے اندر فوج دار محمد خاں کی بڑی مُہر ہے جس میں بہ خطِ طغرائے عربی "فوج دار محمد خاں بہادر" منقوش ہے ۔ اس مُہر کا سنہ ۱۲۶۱ھ ہے ۔ اصل دیوان کے ورق ۱ الف پر انھیں صاحب کی دو چھوٹی مُہریں ثبت ہیں جن میں سنہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ع) منقوش ہے ۔ یہ مُہر کتاب کے اندر بھی کئی جگہ نظر آتی ہے ۔

دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے ، اور شروع میں قصائد درج ہیں ۔ سب سے پہلا قصیدہ فارسی کا ہے جس کا آغاز ہے :

۱- موصوف الذکر ، نواب غوث محمد خاں بہادر کے بیٹے اور نواب سکندر جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے چھوٹے ماموں تھے۔ انھوں نے ذی حجہ ۱۲۸۱ھ (مئی ۱۸۶۵ع) میں انتقال کیا ہے ۔

۲- کلیات نثر ، پنج آہنگ ، صفحہ ۶۳ ۔

"بهر ترویج جنابِ والیِ یوم الحساب[1] ۔" یہ قصیدہ ورق ۱ ب سے شروع ہو کر ۴ الف پر ختم ہو گیا ہے ۔ اس کے بعد ۴ الف کی آخری سطر سے "قصیدہ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت" شروع ہوا ہے جس کا آغاز ہے : "ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار"۔ اس کا انجام ورق ۹ ب کی سطر ۲ پر ہوا ہے ۔ اس کے بعد "ایضاً فی المنقبت" کے عنوان سے دوسرا اُردو قصیدہ ملتا ہے جس کا آغاز ہے : "توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روی زمیں" یہ قصیدہ ورق ۹ ب کی سطر ۳ سے شروع ہو کر ورق ۱۲ ب پر ختم ہوا ہے ۔ اس کے بعد اسی عنوان سے تیسرا قصیدہ شروع ہوتا ہے : "جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۔" یہ ورق ۱۲ ب کی سطر ٦ سے شروع ہو کر ورق ۱۴ الف پر تمام ہوتا ہے ۔

ورق ۱۵ ب : دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں ۔ اس پورے حصے میں دو غزلوں کے درمیان ایک سطر سادہ چھوڑی گئی ہے ۔ ان سادہ جگہوں میں معمولی خط میں جگہ جگہ "ولہ" لکھا ہے ۔ میری رائے میں یہ بدمذاق میرزا صاحب سے ممکن نہ تھی ۔

آخر میں کاتبِ نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے : "دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب ، سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۳۷ من الہجرۃ النبویہ صورت اتمام یافت ۔"

اس عبارت کے نیچے پھر فوج دار محمد خان کی چھوٹی مُہر ہے ۔

دیوان کے متن اور حواشی دونوں میں جگہ جگہ اصلاحیں اور اضافے نظر آتے ہیں ۔ ان کا قلم ، روشنائی اور روشِ خط تینوں مختلف ہیں جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کام مختلف اوقات میں انجام دیا گیا ہے ۔ دیوان کے آخری سادہ اوراق میں بھی بعد کی کہی ہوئی غزلیں لکھی ہیں ، مگر یہ سب ردیف 'یا' کی ہیں ۔ حک و اضافے کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اُس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں ۔ لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا ، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے کسی وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے ۔

کچھ غزلوں کے آغاز کی سادہ جگہوں میں لفظ "غلط" لکھا گیا ہے اور بعض غزلوں پر صرف "غ" اس طرح لکھا گیا ہے کہ اُس کا سر ، مطلع کے دونوں مصرعوں کے بیچ میں آیا ہے اور دائرے نے ساری غزل کو گھیر لیا ہے ۔

۱۔ ملاحظہ ہو کلیات فارسی ، ص ۴۷ ، جہاں یہ بہ عنوان قطعہ ۹۰ فاتحہ مندرج ہے ۔

یہ سب غزلیں وہ ہیں جو نسخۂ شیرانی میں شامل نہیں کی گئی ہیں ۔ چند غزلوں کے مقابل حاشیے پر ''مکرر نوشتہ شدہ'' لکھا ہوا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحبِ ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے[۱] ۔ انھوں نے کئی جگہ اپنی پسند کے اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھا ہے ۔ پہلی غزل کے شعر ''آتشیں پا ہوں'' الخ کے مقابل حاشیے پر لکھا ہے ''ص عبدالعلی''۔ اسی طرح ''نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا'' کے مقابل بھی یہی لکھا گیا ہے ۔ نیز اسی غزل کے تیسرے شعر کے مقابل لکھا ہے : ''ص منہ ۔''

ردیف غ کی پہلی غزل : ''عشاق اشک چشم سے دھوئیں ہزار داغ'' کے متعدد شعروں کے مقابل ''پسند عبدالعلی منہ'' لکھا ہے ۔ اس ردیف کی دوسری غزل کے مقابل لکھا ہے : ''پسند خاطر عبدالعلی ۔''

ورق ۲۸ ب کے اوپر کے حاشیے میں لکھا ہے : ''مقابلہ کردہ شد'' ۔ یہ جس قلم میں ہے وہ اندرونی تغیرات کے قلم سے مشابہ ہے ۔

ورق ۲۹ الف کے حاشیے میں باریکے کے اندر لکھا ہے : ''محمد عبدالصمد مظہر ۔'' میرے لیے یہ صاحب بھی انجان ہیں ۔

آخری سادہ اوراق میں جو غزلیں بہ خطِ بد اضافہ کی گئی ہیں ، اُن میں کی آخری غزل : ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' کے آخر میں اسی قلم سے لکھا ہے : ''دیکھ تو عکس قد یار لب جو پر سے ۔ تمام شد ، کار من نظام شد ۔ رب یسر و تمم بالخیر ۔''

بدنما خط میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں ، مثلاً : ''فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے'' میں ''تقاضا'' کو ''تقضا'' لکھا ہے ۔ یا ''وارستگی بہانہ سنگی دلی نہیں'' میں ''بہانیے ۔'' یا ''بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے'' میں ''مضاعقہ ۔'' یا ''ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست'' میں ''زرہ'' یا ''رنگ ہے سنگ محک دعوای مینائی عبث'' میں ''سنگِ مہک'' یا ''خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں'' میں ''بھاگے نگے ۔'' یا ''آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی'' میں ''غلفت'' لکھ دیا ہے ۔

اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۲۵ سال کی عمر میں سخت

۱۔ خاندان ریاست رام پور کے ایک صاحب عبدالعلی خاں بہادر ابن نواب غلام محمد خاں بہادر تھے ۔ یہ نواب عبداللہ خاں بہادر صدرالصدور میرٹھ کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے میرزا صاحب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں ۔

حیرت انگیز ہیں ۔ اس لیے اس کے باوجود کہ عام طور پر اس انداز کا حک و اضافہ بالعموم بخطِ مصنف ہوا کرتا ہے اور اندرون کلام میں قلم زدگی و اصلاح خود میرزا صاحب کے قلم سے ہونا چاہیے ، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدنما خط کے اندراجات بخط غالب نہیں ہیں ۔

مفتی صاحب کی رائے میں یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خان بہادر بھوپالی کے لیے لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور اُن کی نظر سے گزرا[1] ۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ۔ فی الحقیقت یہ میرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھیں کے پاس رہا تھا ۔

اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں بہادر کے کتاب خانے میں پہنچا ۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا ؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ، لیکن ۱۲۴۸ھ والی مُہر بتاتی ہے کہ بہرحال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی ، جو دیوانِ غالب کے متداول انتخاب کی تاریخِ ترتیب و تالیف ہے ۔

اب وہ تمام اغلاط جو اس مختصر سے وقت میں نوٹ کی جا سکتی تھیں ، نسخۂ حمیدیہ کے صفحات کے مطابق پیش کرتا ہوں ۔ چونکہ یہ سب مفتی صاحب مرحوم کے اختیار کردہ اصول پر مبنی ہیں اس لیے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں بجز اس کے کہ انھیں اپنے اپنے نسخوں میں درج کر لیں ۔ ملاحظہ ہو :

ص ۱۔ جذبۂ بےاختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یہ دونوں شعر اصل میں حاشیے پر خوش خط قلم سے لکھے ہوئے ہیں مگر مرتّب نے اسے ظاہر نہیں کیا ۔ یہ خط متن کے خط سے جدا ہے ۔

ص ۲۔ جنوں گرم انتظار و نالہ بےتابی کمند آیا
سویدا تا بلب زنجیر سے دودِ سپند آیا

اصل میں کاتب نے ''زنجیر دود سپند'' لکھ دیا تھا ۔ غالباً میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ی'' بڑھا کر ''زنجیری'' بنا دیا ہے ۔ اس کو مرتب نے

۱۔ تمہید نسخۂ حمیدیہ ، ٦ ۔

''زنجیر سے'' نقل کیا ہے - [نسخہ شیرانی میں یہ لفظ ''زنجیر ہی'' لکھا ہے - وحید]

ص ۲- ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

اصل نسخے میں : ''برنگ لالہ جامِ بادہ پر محمل پسند آیا'' -

ص ۲- جراحت تحفہ ، الماس ارمغاں ، خونِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد ، غمخوارِ جانِ دردمند آیا

اصل کے اندر پہلے مصرع میں ''داغِ جگر'' ہے -

ص ۳- عالم جہاں بعرض بساطِ وجود تھا
چوں صبح چاک جیب مجھے تار و پود تھا

دوسرے مصرع میں ''جوں صبح'' ہے -

ص ۳- اس غزل کا حسب ذیل شعر مرتّب نے چھوڑ دیا ہے :

عالم طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سر بسر
یا میں غریبِ کشورِ گفت و شنود تھا
تو یک جہاں قماش ہوس جمع کر کہ میں
حیرت مطاعِ عالمِ نقصان و سود تھا

ص ۵- اصل نسخے میں ''حیرت متاع'' ہے اور یہی درست ہے -

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اُس کا
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

اس شعر کے لفظ ''نقش'' پر مرتّب نے یہ حاشیہ لکھا ہے : ''متن میں 'وقف' لکھا ہوا ہے مگر اسے کاٹ کر حاشیے پر 'نقش' بنایا ہے -'' پہلے یہ عرض کردوں کہ اصل نسخے میں یہ ترمیم حاشیے پر نہیں ہے بلکہ بین السطور میں لفظ ''وقف'' کے اوپر پائی جاتی ہے - بعد ازاں یہ گزارش کرنا ہے کہ مرتّب نے مصرع اول میں لفظ ''خرام'' کی جگہ ''خیال'' چھاپ دیا ہے ، جس سے شعر کا مطلب کہیں کا کہیں جا پڑا - اصل نسخے میں یہ اس طرح ہے :

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اُس کا

ص ۵- ہے مکیں کی پاداری نامِ صاحبِ خانہ
ہم نے تیرے کوچے سے نقشِ مدعا پایا

اصل نسخے میں ''مکیں'' کی جگہ ''نگیں'' اور ''ہم نے'' کے عوض ''ہم سے'' ہے -

ص ۵- نے اسد جفا مائل ، نے ستمِ جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈا الفت آزما پایا

اصل میں ''سم جنوں'' کی جگہ ''ستم جنوں'' ہے ۔

ص ۵- عشرت ایجاد چہ بوی و گل و کمُو دود چراغ
جو تری بزم سے نکلا ، سو پریشاں نکلا

اصل میں ''چہ بوی گل'' ہے اور یہی درست بھی ہے ۔ نیز مصرع پر ''لا'' نہیں لکھا گیا بلکہ نسخے کی علامت 'ن' بنا کر نیا مصرع لکھ دیا ہے ۔ مرتب نے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ اضافہ اصل کے حاشیے پر ہے ۔

ص ۶- شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے سے بھی عریاں نکلا

اصل میں ہے : ''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا'' اور یہی تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے ۔

ص ۶- شور رسوائی دل دیکھ کے یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا ، پھر وہی عریاں نکلا

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''پر وہی عریاں نکلا'' ہے اور یہی صحیح ہے ۔

ص ۷- دل گزرگاہ خیال می و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

یہ شعر اصل نسخے کے حاشیے پر خوش خط قلم سے بڑھایا گیا ہے مگر مرتّب نے اس کا اظہار نہیں کیا ۔

ص ۷- ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

اصل میں پہلا مصرع اس طرح ہے : ''ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں راضی کہ کبھی'' ۔ دوسرے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخے ''کرنے میں بھی'' پر متفق ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کاتب سے لفظ 'بھی' چھوٹ گیا ہے ۔ مطبوعہ میں ''کرنے میں بھی'' کی جگہ ''کرنے پہ بھی'' مرتّب کا سہو ہے ۔

ص ۷- حیف اے ننگ تمنا کہ پئے عرض حیا
یک عرق آئنہ بر جبہۂ سائل باندھا

مرتّب نے اس شعر کے پہلے مصرع پر یہ حاشیہ لکھا ہے : ''پہلے یہ مصرع یوں تھا : 'داغ اے حاجت بے درد کہ در عرض حیا ۔' پھر اسے کاٹ کر اس صورت میں تبدیل کر دیا ہے ۔'' حالاں کہ میرزا صاحب نے متن کے مصرع اول کو قلم‌زد نہیں کیا ہے بلکہ اسی پر ''نسخہ'' کا ''ن'' بنا کر حاشیے پر دوسرا

مصرع لکھ دیا ہے۔

ص ۸۔ حسن آشفتگیٔ جلوہ سے عرضِ اعجاز
دستِ موسیٰ بہ سرِ دعویٔ باطل باندھا

اصل میں ہے ''حسنِ آشفتگی جلوہ ہے عرضِ اعجاز''۔

ص ۸۔ نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مرتب نے یہ شعر نقل کیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اصل مخطوطے میں نہیں پایا جاتا۔

ص ۹۔ واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ رشک سے تارِ نگہ نایاب تھا

اصل میں ''ہجومِ اشک میں'' ہے۔ دیگر قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں بھی اسی طرح ہے، لہٰذا اسے مرتب کا سہو مانا جائے گا۔

ص ۱۰۔ شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

اس غزل کے تمام اشعار مطلع کے علاوہ ''شب کہ ذوق گفتگو سے تیری دل بےتاب تھا'' والی غزل (ص ۹) کے حاشیے پر خوش خط مگر قدرے شکستہ آمیز قلم سے مندرج ہیں۔ چنانچہ ان میں صفحہ ۹ کی اسی زمین کی غزل کے ان دونوں شعروں کو بھی شامل کر لیا تھا:

(۱) دیکھتے تھے ہم بچشمِ خود وہ طوفانِ بلا۔ الخ
(۲) موج سے پیدا ہوئے پیراہنِ دریا میں خار الخ

مگر بعد میں شعروں پر ترتیبی نمبر شمار ڈالتے وقت نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ زیر بحث غزل کے حسب ذیل شعر دو بار لکھے گئے ہیں۔ ایک بار شکستہ آمیز اچھے خط میں اور دوبارہ بُرے خط میں:

(۱) جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو
(۲) یاں سرِ پُر شور بیخوابی سے تھا دیوار جُو
(۳) یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بےخودی
(۴) فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا

ص ۱۰۔ نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

یہ غزل حاشیے پر مذکورہ بالا خوش خط قلم سے لکھی گئی ہے۔ مرتّب نے

اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا ہے ۔ نیز اس کے دوسرے شعر :

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا
چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمع خار اپنا

کے دوسرے مصرع میں ''ڈھونڈے ہے'' کی جگہ ''ڈھونڈے سے'' غلط چھپ گیا ہے ، جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔

ص ۱۱ - محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بد دماغی ہے
کہ موجِ بوئ گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

اصل میں ''بے دماغی'' ہے ۔

ص ۱۱ - نہ ہو وحشت کشِ درسِ شرابِ سطرِ آگاہی
میں گردِ راہ ہوں ، بے مدعا ہے پیچ و خم میرا

اس شعر کے دوسرے مصرع پر مرتّب نے یہ حاشیہ لکھا ہے : ''حاشیے پر 'میں گرد راہ ہوں' کی بجائے 'غبار راہ ہوں' بنایا ہے'' ۔ حالانکہ میرزا صاحب بین السطور میں ''میں گرد'' کے اوپر ''غبار'' بنایا ہے ۔

ص ۱۱ - اسد وحشت پرستِ گوشۂ تنہائی دل ہے
برنگِ موجِ مے خمیازۂ ساغر ہے رم میرا

اصل میں پہلے مصرع کا آخری لفظ ''ہوں'' ہے اور یہی صحیح بھی ہے ۔

ص ۱۲ - بعجز آبادِ وہمِ مدعا تسلیم شوخی ہے
تغافل کو نہ کر مصروفِ تمکیں آزمائی کا

مرتّب نے ''مصروف'' پر یہ حاشیہ لکھا ہے : ''حاشیے پر 'مصروف' کی جگہ 'معزول' لکھا ہے ۔'' اولاً تو یہ مناسب تھا کہ مرتب حسب دستور خود اصلاحی لفظ متن میں اور قلمزد لفظ حاشیے پر لکھتے ، ثانیاً یہ کہ اصل نسخے میں حاشیے پر ''معزول'' نہیں ''مغرور'' بنایا گیا ہے ۔ نیز اصل کے کاتب سے مصرعِ اول کا آخری لفظ ''ہے'' چھوٹ گیا ہے ، جو لفظ ''شوخی'' کے اوپر بعد کو بڑھایا گیا ہے ۔

ص ۱۳ - وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

یہ شعر بخطِ خوش مذکورہ بالا اُس غزل کے حاشیے پر مندرج ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے : ''نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا'' مگر مرتب نے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا ہے ۔

ص ۱۴ - عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

اصل میں ہے : ''عجز سے اپنے میں جانا'' الخ - اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے -

ص ۱۴ - سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستان سمجھا

اصل میں ہے ''ہر قدم سایہ کو اپنے میں شبستان سمجھا'' - اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے -

ص ۱۴ - یہ جانتا ہوں کہ تو اور جوابِ نامۂ شوق
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

اصل میں مصرع ثانی کے اندر ''ستم زدہ'' کی جگہ ''جنوں زدہ'' ہے ، مگر اس کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا -

ص ۱۵ - مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے
میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

اصل میں ''پیچتاب'' ملا کر لکھا ہے -

ص ۱۵ - فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسد
اگرچہ گم شدہ ہے کاروبارِ دنیا کا

اصل میں اس مقطعے کے نیچے بڑے خط میں یہ دوسرا مقطع لکھا ہے :

فلک کو دیکھ کے کرتا ہے اُس کو یاد اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

مرتب نے اس مقطعے میں ''کرتا ہوں'' چھاپا ہے -

ص ۱۵ - اس مقطعے کے قبل دو اور شعر بعنوان مطبوعہ درج کیے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس غزل کے یہ شعر اصل میں نہیں ہیں حالانکہ اصل کے حاشیے پر چار شعر قدرے اچھے خط میں مندرج ہیں جن میں سے یہ شعر بالکل ترک کر دیا ہے :

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

اور اس شعر کو :

ملی نہ وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم کو
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

صرف جدید مصرع اول کے ساتھ متن کے اندر لکھا ہے اور قدیم مصرع حاشیے میں نقل کیا ہے - حالانکہ ان کے دستور کے مطابق دونوں مصرعے متن میں درج ہونا چاہیں تھے -

ص ۱۶ - ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اصل میں یہ دو شعر اگلے اشعار کے ساتھ حاشیے پر بخطِ قدرے خوش تحریر ہے ، مگر مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے -

ص ۱۶ - بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے تو میں ہوں خمیازہ ساحل کا

اصل میں ''خمارِ تشنہ کامی ہا'' تھا - اس میں میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ہا'' کو ''بھی'' بنایا ہے -

ص ۱۶ - مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

مرتب نے ''گمراہی'' پر حاشیہ لکھا ہے : ''متن میں پہلے یہ مصرع یوں تھا : 'مجھے اس قطع رہ میں' الخ ، اسے کاٹ کر یہ اصلاح کی گئی ہے'' - اس حاشیے میں لفظ ''کاٹ کر'' قابل نظر ہے - اس لیے کہ اصل نسخے میں کسی لفظ کو قلمزد نہیں کیا ہے - نئے الفاظ بین السطور میں پرانے لفظوں کے نیچے لکھ دیے گئے ہیں اور پرانے لفظ بھی جوں کے توں موجود ہیں -

ص ۱۷ - غریبِ بدرجستہ' باز گشتن
سخن ہوں سخن بر لب آوردگاں کا

اصل میں ''بدرجستہ'' کی جگہ حاشیے پر ''ستم دیدہ'' تجویز کیا ہے - یہ بخطِ معمولی ہے - مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے -

ص ۱۹ - رحمت اگر قبول کرے ، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

یہ دونوں شعر اصل نسخے کے حاشیے پر مذکورہ قدرے خوش خط قلم سے مندرج ہیں - اس کو ظاہر کرنا چاہیے تھا جیسا کہ صفحہ ۲۰ کے حاشیہ نمبر ۱ میں کیا ہے -

ص ۱۹ - رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یہ شعر آئندہ دو شعروں کے ساتھ اصل کے حاشیے پر بخطِ مذکورہ بالا تحریر ہے ، اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا -

ص ۲۱ - گروہ مستِ نازِ تمکیں دے صلائے عرضِ حال
خارِ گل ، بہرِ دہانِ گل زباں ہو جائے گا

میرزا صاحب نے پہلے مصرع کے لفظ ''تمکیں'' پر ''لا'' علامت نفی بنا کر داہنے حاشیے پر ''دے گا'' لکھا ہے ، گویا اس مصرع کو یوں بنایا ہے : ''گروہ مست ناز دیوے گا صلائے عرض حال'' - اس کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا - نیز دوسرا مصرع پہلے یوں تھا : ''خار گلبن در دہان گل زباں ہو جائے گا'' - اس میں گلبن کو متن کے اندر ہی ''گل'' بنا دیا ہے ، اور ''در'' کو قلمزد کر کے اوپر ''بہر'' لکھا ہے - مرتب نے اس ترمیم کا بھی ذکر نہیں کیا -

ص ۲۲ - گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائے گا

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''مثلِ خوں در رگ'' ہے - مرتب نے اس کو غلط نقل کیا ہے -

ص ۲۲ - فائدہ کیا ، سوچ ، آخر تو بھی ہے دانا اسد
دوستی ناداں کی ہے ، جی کا زیاں ہو جائے گا

اصل میں ہے : ''تو بھی دانا ہے اسد'' اور اسی طرح دیگر قلمی و مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے - مرتب نے اس کو غلط نقل کر دیا ہے - نیز اصل میں 'سوچ' ہے - ہاں یہ تمام شعر حاشیے پر بخطِ مذکورہ بالا مندرج ہیں - مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے -

ص ۲۳ - گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو
خانۂ حاتم میں یاقوتِ نگیں اختر ہوا

اصل میں ''اخگر ہوا'' درج ہے اور یہی صحیح بھی ہے -

ص ۲۳ - اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

یہ شعر مرتب نے 'مطبوعہ' کے عنوان کے تحت لکھا ہے حالانکہ یہ شعر اُس برے خط میں ، جس میں اکثر اصلاحیں نظر آتی ہیں ، حاشیے پر مندرج ہے -

ص ۲۳ - تا کجا افسوس گرمیہائے صحبت اے خیال
دل ز آتش خیزیِ داغِ تمنا جل گیا

مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے کہ ''حاشیے پر 'آتش خیزی' کی بجائے 'سوز آتش' بنایا ہے'' حالانکہ اصل نسخے میں ''آتشخیزی'' کے نیچے بغیر اسے قلمزد کیے ''بہ سوز آتش'' تحریر ہے - مرتب نے سہواً 'بہ' کو 'ز' سے بدل دیا ہے -

ص ۲۳ - ہے اسد بیگانۂ افسردگی اے بے کسی
دل ز اندازِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

اصل میں ''بیگانہ ای افسردگی ای بیکسی'' لکھا ہے - میرے خیال میں دونوں جگہ ''ای'' علامتِ اضافت کے لیے کاتب نے استعمال کیا ہے - مرتب نے دوسرے کو حرف ندا قرار دیا ہے - نیز اس مقطع پر اصل کے اندر ''لا لا'' تحریر ہے - گویا اس کو کالعدم ٹھہرایا ہے - مگر مرتب نے اس کو بھی ظاہر نہیں کیا -

ص ۲۳ - دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یہ شعر مع آیندہ ۲ اشعار کے قدرے خوشخط قلم سے حاشیے پر ہے - اور اس شعر:

ص ۲۴ - دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا ، کارفرما جل گیا

کے مصرع اولِ میں ''تجھ کو دکھاتا'' کی جگہ ''تجھ کو دکھاؤں'' ہے - اس فرق کو بھی ظاہر کرنا چاہیے تھا -

ص ۲۴ - کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اصل میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: ''تھا میں صحرا میں کہ گھر یاد آیا -'' مرتب نے اسے نظر انداز کر دیا ہے -

ص ۲۵ - تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اصل میں ہے : ''وہ ظلم کہ مجھ پر نہوا تھا'' اور یوں ہی تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں بھی پایا جاتا ہے -

ص ۲۶ - اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اصل میں مصرع اول پر ''ن'' بنا کر بائیں حاشیے میں لکھا ہے: ''بیداد عشق سے نہیں ڈرتا ہوں پر اسد -'' مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا -

ص ۲۶ - جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

یہ شعر مع باقی اشعار کے اصل کے حاشیے پر مندرج ہے لیکن اس کے مصرعِ ثانی میں ''ہوں شمع کشتہ'' کی جگہ ''جوں شمع کشتہ'' ہے -

ص ۲۶ - مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

اصل میں دوسرا مصرع یوں ہے: ''اب لائقِ توجہ قاتل نہیں رہا'' - مرتب نے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا -

ص ۲۷ - رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یہ شعر اصل کے حاشیے پر مندرج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے -

ص ۲۸ - مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

یہ بھی اصل کے حاشیے پر مندرج ہے ، مگر وہاں ''مشہدِ عاشق کے کوسوں تک'' لکھا ہے -

ص ۲۹ - غمِ مجنوں عزادارانِ لیلیٰ کا پرستش گر
خمِ رنگِ سیہ از حلقہ ہای چشمِ آہو تھا

اس کے دوسرے مصرع کے الفاظ ''از حلقہ ہای'' کو قلمزد کر کے اوپر ''لا لا'' لکھا ہے اور نیچے بین السطور میں بنایا ہے: ''پیمانۂ ہر'' - گویا مصرعے میں اصلاح کر کے یوں قرار دیا ہے :

خمِ رنگِ سیہ پیمانۂ ہر چشمِ آہو تھا

نیز اس غزل کا مقطع پہلے یہ تھا :

ص ۲۹ - اسد خاکِ درِ میخانہ ہا بر فرق پاشیدن
خوشا روزی کہ آب از ساغرِ مے تا بزانو تھا

اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا - اصل میں بین السطور کے اندر پہلے مصرع کو اس طرح بنایا ہے: ''اسد خاکِ درِ میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں'' اور بین السطور ہی میں دوسرے مصرع کو اصلاح دے کر یوں بنایا ہے: ''گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے سے زانو زانو تھا'' مگر چونکہ کاتب نے 'زانو زانو' کو 'رنو رنو' لکھ دیا ہے ، مرتب اس غلطی کو سمجھ نہیں سکے اور مصرع یوں قرار دیا :

''گئے وہ دن کہ پانی جام مے سے تا بزانو تھا''

ص ۲۹ - نفس حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیِ مژگاں
مگر یک دست دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

دوسرے مصرع کے ابتدائی الفاظ یہ تھے: ''مگر دستے بدامان نگاہ'' الخ مرتب نے اس حقیقت کو بھی ظاہر نہیں کیا -

ص ۳۰ - نزاکت سے فسون دعویٰ طاقت شکستن ہا
شرار سنگ انداز چراغ از جسم خستن ہا
اصل میں ہے : نزاکت ہے فسون دعوی طاقت شکستن ہا
ص ۳۱ - بہ رہن شرم ہے با وصف شہرت اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرار سنگ نا پیدا ہے نام اس کا
اصل میں پہلے دوسرا مصرع اس طرح تھا : ''نگیں میں جوں شرر در سنگ الخ -'' مرتب نے اس اصلاح کو ظاہر نہیں کیا -
ص ۳۱ - مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ پیدا ہے
کہ داغ آرزوے بوسہ لایا ہے پیام اُس کا
شعر کے دوسرے مصرع میں ''لایا ہے'' پر نشان دے کر حاشیے پر لکھا ہے : ''دیویگا'' - گویا اس مصرع میں تغیر کیا ہے ، مگر اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا -
ص ۳۳ - ساتھ جنبش کے بیک بر خاستن طے ہو گیا
تو کہے ، صحرا غبار دامن دیوانہ تھا
اس دوسرے مصرع میں پہلے ''تو کہے'' کی جگہ ''گوئیا'' تھا - مرتب نے اس اصلاح کو بھی چھوڑ دیا ہے -
ص ۳۴- جوش می کیفیتی ہے اضطراب آرا اسد
ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزش مستانہ تھا
پہلے مصرع میں ''اضطراب آرا'' کی جگہ ''اضطراب اندیش'' اور ''تڑپنا'' کی جگہ ''طپیدن'' تھا - مرتب نے دوسری اصلاح کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے ، مگر پہلی کو چھوڑ دیا ہے -
ص ۴۱- دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا
یہ غزل اصل کے حاشیے پر (ورق ۱۹ الف) قدرے خوشخط قلم سے درج ہے ، مگر مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے -
ص ۴۱- تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
اصل میں ''موت'' کی جگہ ''مرگ'' ہے -
ص ۴۱- دل تا جگر کہ ساحل دریاے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
اصل میں کاتب نے پہلے مصرع کے اندر ''دل تھا جگر'' سہواً لکھ دیا

ہے - مرتب نے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا -

ص ۴۲- محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ غزل بھی حاشیے میں درج ہے مگر مرتب نے اسے اُن غزلوں کے زمرے میں رکھا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں -

ص ۴۴- دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا ؟

یہ غزل بھی ورق ۱۸ الف کے حاشیے پر موجود ہے مگر اس کا خط برا ہے - نیز دوسرے مصرع میں "بھرتے تلک" ہے - اس کو مرتب نے موجودہ مطبوعہ نسخوں کے مطابق چھاپا ہے - ہاں اصل میں ہر جگہ فرماویں ، جاویں وغیرہ ہے -

ص ۴۴- بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا ؟

اصل میں اس کے دوسرے مصرع کا لفظ "گے" کاتب سے چھوٹ گیا ہے - مرتب نے اس غلطی کو نہیں بتایا -

ص ۴۴- خانہ زادِ زلف ہیں ، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ؟
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا ؟

اس کے دوسرے مصرع میں "بلا" کی جگہ "وفا" ہے جو دیگر تمام نسخوں کے مطابق ہے ، مگر مرتب نے غلطی سے لفظ بدل دیا ہے - نیز اصل میں کاتب نے پہلے مصرع میں "بھاگیں گے" کو اس طرح لکھا ہے "بھاگے نگے" -

ص ۴۴- ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں ، کھائیں گے کیا ؟

اصل میں ہے "دلّی میں رہے" - اسی طرح دیگر نسخوں میں ہے - صرف نظامی ایڈیشن میں "رہیں" چھپ گیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے مرتب نے نقل کیا ہے -

ص ۵۱- عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یہ غزل ورق ۳۵ الف و ب کے حاشیے پر موجود ہے اور بڑے خط میں لکھی ہوئی ہے - اس کا عکس بھی نسخۂ حمیدیہ میں شائع ہو چکا ہے - مگر مرتب نے اسے ان غزلوں میں شامل کیا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں -

ص ۵۱- دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا

اصل کے کاتب نے مصرع اول میں ''کشمکش'' اور ''رحمت'' لکھا ہے۔
نیز اصل میں ''عقدیکا'' املا ہے، ''عقدہ کا'' نہیں جو مرتب نے اختیار کیا ہے۔

ص ۵۱- ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''پانی کا جدا ہو جانا'' لکھا ہے۔

ص ۵۳- پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

یہ غزل اصل کے حاشیے پر درج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۵۳- چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

اصل میں پہلا مصرع ''موجِ گل'' سے شروع ہوتا ہے۔ بظاہر یہ کاتبِ اصل کی غلطی ہے لیکن مرتب کو حاشیے میں یہ فرق بتانا چاہیے تھا۔

ص ۵۳- جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

اصل میں دوسرا مصرع یوں ہے: ''سر سے گزری تھی یہی بال ہما موج شراب''
یہ اصل کے کاتب کا سہو ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۵۳- موجۂ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

اصل میں دوسرے مصرع کی ردیف کو کاتب نے بدل کر ''ہو جانا'' لکھ دیا ہے یعنی ''ہے تصور میں زبس جلوہ نما ہو جانا'' جو مرزا غالب کو نظر بھی نہ پڑا اور جوں کا توں باقی رہا۔ مرتب نے اس کو بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۵۳- ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

اصل میں ہے ''ایک عالم میں ہے''۔ مرتب نے اسے بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۵۴- شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''ہنگامہ'' کی جگہ ''کیفیت'' ہے اور دوسرا مصرع اس طرح ہے ''رہبر قطرہ بدریا ہے، خوشا موج شراب''۔ یہاں مرتب نے مصرع ثانی نقل کرتے وقت غلطی کی ہے کیونکہ اسی غزل میں یہ مصرع آ چکا ہے۔

ص ۵۵- گرمی ہے زباں کی سببِ سوختنِ جاں
ہے شمع شہادت کے لیے سربسر انگشت

اصل میں پہلے یونہی تھا لیکن بعد کو دوسرے مصرع میں ''ہے'' کو ''ہر''

بنا دیا ہے ۔ مرتب نے اس اصلاح کا تذکرہ نہیں کیا ۔

ص ۵۵- خوں دل میں جو میرے نہیں باقی ، تو عجب کیا
جوں ماہیِ بےآب تڑپتی ہے ہر انگشت

اصل میں ''تو عجب کیا'' کی جگہ ''تو پھر اوس کی'' ہے ۔

ص ۵۵- کس رتبہ میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل
آتی نہیں پنجے میں بس اس کی نظر انگشت

لیکن اصل میں ''اس کی نظر'' کی بجائے ''اوس کے نظر'' ہے ۔

ص ۵۵- افسوس کہ زنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کے تھے در خورِ عقدِ گہر انگشت

یہاں مرتب نے ''کی تھی'' کی جگہ ''کے تھے'' چھاپ دیا ہے حالانکہ انگشت بالاتفاق موئنث ہے ، نیز اصل کے کاتب نے بجائے ''گہر'' ''گوہر'' لکھ دیا ہے ۔ مرتب نے اس کا بھی اظہار نہیں کیا ۔

ص ۵۵- کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''ترا چھلے کا نہ دینا'' ہے ، یونہی دیگر نسخوں میں بھی ہے ۔ صرف نظامی میں ''تری'' چھپ گیا ہے ۔ مرتب نے بلا تحقیق اسی سے نقل کر دیا ہے ۔ نیز اصل کے کاتب نے سہواً ''بموقت'' لکھ دیا ہے جو مرزا صاحب کی نظر سے بھی چوک گیا اور جوں کا توں باقی رہا ۔ مرتب نے اس غلطی کا بھی ذکر نہیں کیا ہے ۔

ص ۵۷- جگر کو مرے عشق خوں نابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

اصل کے کاتب نے پہلے مصرع میں ''خونبابہ مشرب'' لکھا ہے ۔ اس غلطی کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا اور خود بھی غلط لکھا ۔ صحیح لفظ 'خونابہ' ہے ۔

ص ۵۷- دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت

دوسرے مصرع میں اصل کے کاتب نے سہواً ''دل و دوست'' لکھ دیا ہے ۔ مرتب نے اس غلطی کو نہیں بتایا ۔

ص ۵۷- نہیں گریہ کامِ دلِ خستہ گردوں
جگر خواہی جوشِ حسرت سلامت

اصل کے کاتب نے ''کریکام'' لکھ دیا ہے ۔ مرتب نے اس سہو کو ''گریہ کام'' پڑھا ۔ صحیح ''گر بکام'' ہے ۔

ص ۵۷- نہ اوروں کی سنتا ، نہ کہتا ہوں اپنی
سرِ خستہ دشوارِ وحشت سلامت

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''دشوار وحشت'' کی جگہ ''و شورِ وحشت'' ہے اور یہی صحیح بھی ہے -

ص ۵۹- نازِ لطفِ عشق باوصفِ توانائی عبث
رنگ ہے سنگِ مہک دعوائے مینائی عبث

دوسرے مصرع میں ''سنگِ مہک'' چھاپ دیا ہے حالانکہ اصل میں ''محک'' ہے -

ص ۵۹- ناخنِ دخلِ عزیزاں یک قلم ہے نقب زن
پاسبانِ طلسمِ کنجِ تنہائی عبث

شعر کے دوسرے مصرع میں ''کنج تنہائی'' کو ''گنج تنہائی'' لکھ دیا ہے -

ص ۶۰- یک نگاہ گرم ہے جوں شمع سر تا پا گداز
بہرِ از خود رفتگاں رنجِ خود آرائی عبث

پہلے ''ناز خود آرائی'' تھا ، بعد میں ''رنج خود آرائی'' بنایا ہے ، مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا -

ص ۶۱- حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار
سر رشتہ چاکِ جیب کا تارِ نظر ہے آج

اصل میں ''ہر رشتہ'' ہے -

ص ۶۱- اے عافیت کنارہ کر ، اے انتظار چل
سیلابِ گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

اصل میں ہے ''اے انتظام چل'' اور یوں ہی دیگر تمام نسخوں میں بھی ہے - مرتب نے سہواً ''انتظار'' چھاپ دیا ہے -

ص ۶۲- اے اسد ہے مستعدِ شانہ گشتن بہرِ زلف
پنجۂ مژگاں بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

اصل میں پہلے یونہی تھا مگر پھر ''شانہ گشتن بہر زلف'' کے نیچے ''گیسو شدن'' اصلاح کی ہے ، یعنی مصرع اصلاح کے بعد یوں ہوا : ''اے اسد ہے مستعد شانۂ گیسو شدن -'' مرتب نے اس اصلاح کا ذکر نہیں کیا -

ص ۶۵- آئنہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بس کہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

اصل میں پہلے ''یکسر'' کی جگہ ''تجھ سے'' تھا ، بعد میں یہ تغیر کیا گیا ہے - مرتب نے اسے بھی ظاہر نہیں کیا ہے -

ص ٦٦- کون ہوتا ہے حریفِ مئ مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اصل میں ''لبِ ساقی میں'' ہے - دیگر نسخوں میں بھی سوائے نظامی ایڈیشن کے اسی طرح ہے - مرتب نے اسی سے نقل کر دیا ہے اور اصل کی قرأت کو ظاہر نہیں کیا -

ص ۷۲- فسونِ یک دلی ہے لذتِ بیداد دشمن پر
کہ وجدِ برق جوں پروانہ بال افشاں ہے خرمن پر

اصل میں ''چوں پروانہ'' ہے -

ص ۷۳- برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھا ہے بالِ یک تپیدن پر

اصل میں ''باندھے'' ہے -

ص ۷۳- اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشق ناز کر خون تمنا میری گردن پر

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''کہتا تھا'' کو مرزا صاحب نے ''کہتا ہے'' بنایا ہے - مرتب نے دوسرے مصرع کو تو لکھا مگر اس فرق کو ظاہر نہیں کیا -

ایک بات اور ذکر کے قابل تھی مگر مرتب نے چھوڑ دی - وہ یہ ہے کہ اس غزل کے وہ تین شعر جو بعنوان مطبوعہ نقل کیے گئے ہیں ، اصل کے حاشیے پر تحریر ہیں - ان میں سے :

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اصل میں مصرع اول میں ''تقضا'' سہوِ کاتب ہے - مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا - نیز ''قرض'' کی جگہ ''فرض'' چھاپ دیا ہے -

ص ۷۹- اے شعلہ ! فرصتی کہ سویدائے دل سے ہوں
کشت سپند صد جگر اندوختن ہنوز

اصل نسخے میں 'شعلہ' ساقط ہے ، اس لیے ''شعلہ'' بڑھا کر حاشیے میں اس کا اظہار لازم تھا -

ص ۸۰- ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوۂ ناز

لیکن اصل کے کاتب نے ''زرہ'' سہواً لکھ دیا ہے - مرتب نے اس غلطی کا اظہار نہیں کیا -

ص ۸۳- اضطراب نارسائی مایۂ شرمندگی
ہے عرق ریزیِ خجلت جوششِ طوفانِ عجز

اصل میں پہلے ''موجد شرمندگی'' تھا - اسے قلم زد کر کے غالب نے ''مایۂ شرمندگی'' بنایا ہے - مرتب نے اس اصلاح کو ظاہر نہیں کیا -

ص ۸۵- میں بھی رک رک کے نہ مرتا ، جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

حسبِ تصریحِ مرتب اصل کے حاشیے پر یہ شعر بھی موجود ہے مگر اصل کے کاتب نے ''ترے غمخوار'' لکھا ہے - اس کا اظہار ضروری تھا -

ص ۸۵- دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

اصل کے کاتب نے نمو کے واؤ پر تشدید لگا دی ہے - مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا -

ص ۹۲- وقتِ خیالِ جلوۂ حسنِ بتاں اسد
دکھلاوے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

اصل میں پہلا مصرع ابتداءً یوں تھا : ''در عالمِ تصورِ روے بتاں اسد'' - بعد میں مرزا صاحب نے اس کو بدل دیا مگر مرتب نے اس اصلاح کا ذکر نہیں کیا -

ص ۹۶- مجھ کو ارزانی رہے ، تجھ کو مبارک ہوجیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

اصل میں ہے ''سینۂ بلبل کا زخم'' - مرتب نے اس فرق کو ظاہر نہیں کیا ہے -

غیر کی منت نہ چھوڑوں گا پئے توفیرِ درد
زخمِ دل جوں خندۂ خوباں ہیں سر تا پا نمک

اصل میں دوسرے مصرع میں ''خوباں ہے'' لکھا ہے اور یہی صحیح بھی ہے - اس کو مرتب نے غلط چھاپ دیا ہے -

ص ۹۶- اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسد
زور نسبت مے سے رکھتا ہے اضارا کا نمک

اصل میں ''نصارا کا نمک'' ہے اور یہی درست ہے -

ص ۹۷- آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

اصل میں اس غزل کی ردیف ہر جگہ ''ہوتے تک'' ہے - خود مرزا صاحب نے اس کو ''ہوتے تک'' ہی لکھوایا ہے اور چھپوایا ہے - مگر مرتب نے ناقابلِ اعتبار جدید مطبوعہ نسخوں سے ''ہونے تک'' نقل کر دیا ہے جو کسی طرح مستحقِ قبول نہیں -

ص ۹۸- ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں اسد
ہے بر سرِ مژہ نگراں دیدبانِ اشک

پہلے مصرع اول اس طرح تھا : ''در حالِ انتظارِ قدومِ بتاں اسد'' ۔ اس کے ابتدائی الفاظ قلم زد کر کے اوپر بین‌السطور میں اصلاح کی گئی ہے ۔ مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۱۰۱- نور سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

پہلے مصرع اول اس طرح تھا : ''نور حیدر سے ہے اس کی روشنی''۔ اس میں سے حیدر کو قلم زد کر کے نیچے موجودہ الفاظ بڑھائے ہیں ۔

ص ۱۰۳- خاک ہے عرضِ بہارِ صد نگارستان اسد
حسرتیں کرتی ہیں میری خاطر ایجاد گل

اصل میں دوسرا مصرع پہلے یوں تھا ''آرزوئیں کرتی ہیں'' الخ۔ مرتب نے اس کا ذکر نہیں کیا ۔

ص ۱۰۵- دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پر خوں کو زنداں خانہ ہم

اس کے حاشیے میں مرتب نے لکھا ہے کہ دوسرا مقطع کمھہ کر حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ حالانکہ پہلے مصرع ''شام غم میں سوز عشق شمع رویاں سے اسد'' کی بجائے دوسرا مصرع دونوں غزلوں کے درمیان کی سادہ جگہ میں لکھا گیا ہے ۔

ص ۱۰۹- تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

اصل میں پہلا مصرع اس طرح ہے : ''تھی وہ خوباں ہی کے تصور سے'' ۔ مرتب نے مطبوعہ سے مصرع نقل کیا اور اس فرق کو ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۱۰۹- بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے
پر مجھے طاقتِ سوال کہاں

اصل میں کاتب نے از راہِ سہو ''مضاعقہ'' لکھا ہے ۔

ص ۱۱۱ - عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

یہ شعر مع آئندہ دو شعروں کے بعنوان مطبوعہ لکھا ہے حالانکہ یہ تینوں شعر حاشیۂ اصل پر بخطِ بد موجود ہیں مگر مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۱۱۳ - آئنہ دام کو پردے میں چھپاتا ہے عبث
کہ پری زاد نظر قابل تسخیر نہیں

اصل میں 'آئنہ' اور 'پریذاد' ہے - نیز پہلے کاتب نے سہواً ''قابل تقریر'' لکھ دیا تھا ، پھر لفظ ''تقریر'' کاٹ کر اس کے نیچے ''تسخیر'' لکھا ہے -

ص ۱۱۳ - میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

اصل میں ''اوس کا دیوان'' ہے -

ص ۱۱۵ - دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں

اصل میں ''اپنے درد دل'' کی جگہ ''اپنی بیکسی'' ہے اور یہی تمام مطبوعہ نسخوں میں بھی پایا جاتا ہے - خدا جانے کہاں سے مرتب نے ''درد دل'' چھاپ دیا ہے - نیز اس غزل کے تمام شعروں کی ردیف ''یہاں'' اصل میں بہ ہائے مخلوط التلفظ لکھی ہے -

ص ۱۱٦ - ہے مری وحشت عدوے اعتبارات جہاں
مہر گردوں ہے چراغ رہگزار باد یاں

یہ شعر اصل کے حاشیے پر بخط بد درج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا -

ص ۱۱٦ - قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

یہ شعر بھی اصل کے حاشیے پر درج ہے -

ص ۱۱۹ - بر شکالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوار چمن

اس شعر کا پہلا مصرع اصل میں یوں ہے : ''برشکالِ گریہ عشاق دیکھا چاہیے'' - مرتب نے مصرع مطبوعہ نسخے سے نقل کرایا ہے اور اس فرق کو ظاہر نہیں کیا ، نیز ''کِھل گئی'' کو ''کُھل گئی'' چھاپا ہے ، جو صراحةً غلط ہے -

ص ۱۲۲ - سر پر مرے وبال ہزار آرزو رہا
یا رب میں کس غریب کا بخت رمیدہ ہوں

مرتب نے اسے اس طرح لکھا ہے گویا یہ اصل دیوان کے متن کا شعر ہے - حالانکہ ص ۱۲۲ کی غزل ''خوں در جگر نہفتہ بزردی رسیدہ ہوں'' کے حاشیے پر اسی مطلع کے ساتھ لکھا ہے -

ص ۱۲۲ - اس شعر کے ساتھ وہ شعر بھی اُسی غزل کے حاشیے پر تحریر ہے جس کو مرتب نے حاشیے میں سابق غزل کے حاشیے پر لکھا ہونا ظاہر کیا

ہے ، یعنی :

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

نیز اصل میں ''ہو گرمیِ نشاط الخ'' لکھا ہے ، نون سہواً چھوٹ گیا ہے۔

ص ۱۴۷ - چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں پہلا مصرع سہواً یوں لکھا گیا ہے : ''چھوڑا نہ مجھ ضعیف نے رنگ اختلاط کا'' مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا ۔ نیز اس غزل کو اُس کلام کے زمرے میں درج کیا ہے جس کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں اور حال یہ ہے کہ اصل کے حاشیے میں یہ غزل موجود ہے جس کا اقرار خود مرتب نے اپنے حاشیے میں کیا ہے ۔

ص ۱۴۷ - پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

اصل کے دوسرے مصرع میں ''جارہ'' ہے جو سہو ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۱۴۷ - ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

اصل کے دوسرے مصرع میں سہواً لفظ ''سے'' ترک ہو گیا ہے ، مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۱۴۸ - وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں پہلا مصرع یوں ہے ''وارستگی بھانۂ سنگی دلی نہیں'' اور ''بہانۂ'' کو ''بہانئے'' لکھا ہے ۔ مرتب نے نہ اس اصلاح کا ذکر کیا نہ کاتب کے سہو کا ۔

ص ۱۴۸ - مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں دوسرا مصرع اس طرح ہے : ''ہر چند عمر صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو'' ۔ اس کو ظاہر نہیں کیا گیا ۔

ص ۱۶۸ - کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اصل میں ہے : ''کھلتے کسو پہ کیوں مرے دل کے معاملے'' ۔

ص ۱۷۰ - جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک ِ پاش ِ خراش دل ہے لذت زندگانی کی

اصل میں ''گر'' کی جگہ ''گو'' ہے ، اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۸۹ - مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

اصل میں کاتب نے ''فزائے حیرت آباد'' سہواً لکھ دیا تھا ، مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۱۸۹ - اسی طرح اس غزل کے دوسرے شعر :
خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

کو اصل میں ''وہ ہم ہیں'' سے شروع کیا گیا ہے جو سہو ہے - مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۱۹۸- افسردگی نہیں طرب افشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

اصل میں ''ہاں'' کی جگہ ''جوں'' ہے -

ص ۲۳۲- مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

یہ غزل اصل کے حاشیے پر بخط ِ بد موجود ہے اور اس میں یہ شعر زائد ہے :
وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے
صاحب کے ہمنشیں کو کرامات چاہیے

ص ۲۳۲- اصل میں یہ شعر بھی دوسرے مطبوعہ نسخوں کی طرح موجود ہے مگر مرتب سے چھوٹ گیا ہے :
دے داد اے فلک دل ِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی ِ مافات چاہیے

ص ۲۳۲- سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ِ ملاقات چاہیے

اصل میں کاتب سے لفظ ''مہ'' سہوا چھوٹ گیا ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا ۔

ص ۲۳۲- ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اصل میں دوسرے مصرع کا لفظ 'کا' سہواً ترک ہو گیا ہے مگر مرتب نے اس کا ذکر نہیں کیا ۔

ص ۲۴۲- سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

اصل میں مصرع اول کے اندر ''چاہیے'' کی جگہ ''کھینچیے'' ہے - نیز لفظ ''پہ'' کاتب سے ترک ہو گیا ہے - مرتب نے ان دونوں کا ذکر نہیں کیا -

ص ۲۴۳- عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

یہ غزل بھی حاسیے پر بخطِ بد درج ہے مگر مرتب نے اسے اُن غزلوں میں شمار کیا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں ہے -

ص ۲۴۳- اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اصل میں کاتب نے دوسرے مصرع میں سہواً ''غلفت'' لکھ دیا ہے - مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا -

ص ۲۴۳- یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گو نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اصل میں ہے ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'' -

ص ۲۴۴- دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

یہ غزل اصل دیوان کے آخر میں بخطِ بد مندرج ہے - مرتب نے اسے اُن غزلوں کے زمرے میں شمار کیا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں ہے -

ص ۲۴۵- ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

اصل میں ''پری وش'' متن میں اور اس کے اوپر بغیر ''وش'' کو قلم زد کے ''رخ'' لکھا ہے -

ص ۲۴۶- گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

یہ غزل بھی اصل کے آخر میں مذکورہ بالا غزل کے بعد درج ہے - مرتب نے اسے بھی انھیں غزلوں میں شمار کیا ہے جو اصل میں نہیں ہیں - اصل میں درج ذیل شعر تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے زائد ہیں - مرتب نے انھیں نقل نہیں کیا :

زندگی میں بھی رہا ذوق فنا کا مارا
نشّہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے

بس کہ ہے فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن
رنگ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے
جلوۂ خور سے فنا ہوتی ہے شبنم غالب
کھو دیا سطوت اسمائے جلالی نے مجھے

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ دوسرے شعر میں اصل نسخے کے اندر ''ندیا'' کی جگہ ''نادیا'' کاتب کا سہو قلم ہے:

ص ۲۵۲- پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

یہ غزل اصل کے آخر میں درج ہے، اور اس کے شعر:

وہی صد رنگ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشک باری ہے

کے دونوں مصرعوں میں ''وہی'' کی جگہ ''وہ ہی'' لکھا ہے:

ص ۲۵۳- پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''بے قراری کا حکم'' ہے اور پہلے مصرع میں ''ہوے ہے''۔

ص ۲۶۶- چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

یہ غزل آخر میں چوتھے نمبر پر درج ہے اور مصرع اول میں ''اچھوں'' کی جگہ ''خوباں'' لکھا ہے:

ص ۲۶۶- یہ شعر اصل میں زیادہ ہے:

دل تو ہو، اچھا نہیں ہے گر دماغ کچھ تو اسبابِ تمنا چاہیے

ص ۲۶۶- نیز ''غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے'' والا شعر مقطع کے بعد لکھا ہے اور اسی طرح دیوان مطبوعہ منشی شیو نرائن میں بھی ہے:

ص ۲۶۸- وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

یہ غزل اصل کے آخر کی غزلوں میں پانچویں نمبر پر درج ہے، اور حسب ذیل نئے شعر پر مشتمل ہے:

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں، لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

ص ۲۷۳- کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یہ غزل چھٹے نمبر پر درج ہے ۔ اس میں ایک تو ''تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی'' والا شعر متروک ہے اور دوسرے ''نہ پوچھا جائے ہے اُس سے ، نہ بولا جائے ہے مجھ سے'' میں دونوں جگہ ''مجھ سے'' لکھ دیا ہے ۔

ص ۲۸۴- مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

یہ غزل ساتویں نمبر پر درج ہے مگر ''پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس'' والا شعر متروک ہے ۔

ص ۲۸۴- پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

اصل میں اور دیگر تمام نسخوں میں ''بھر رہا ہوں'' ہے ۔

ص ۲۸۵- دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

اصل میں پہلے مصرع کے الفاظ ''پھر ہر'' سہواً ترک ہو گئے ہیں ۔

ص ۲۸۵- مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''ڈھونڈے ہے پھر کسو کو لب بام پر ہوس'' ۔

ص ۲۸۵- چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''مانگے ہے پھر کسو کو ۔''

ص ۲۸۶- اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

اصل میں ہے : ''چاہے ہے پھر نگاہ ۔''

ص ۲۸۶- ''پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

اصل میں ہے : ''پھر دل میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں ۔''

ص ۲۸۶- جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''بیٹھے رہے'' الخ ۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نسخۂ بھوپال کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہوتا تو نسخۂ حمیدیہ کی نئی ترتیب اور تصحیح میں کس قدر مدد ملتی ۔ اور نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے سے کیسا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے ۔

ڈاکٹر سید حامد حسین

دیوان غالب (نسخۂ بھوپال) پر ثبت دستخط اور مُہریں

دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ جو بھوپال میں میاں فوجدار محمد خاں (۱۸۱۱ع - ۱۸۶۵ع) کے کتب خانے میں محفوظ رہا، کلام غالب کے قدیم ترین نسخوں میں سے تھا۔[1] اس نسخے کی اہمیت اس وجہ سے بھی تھی کہ اس میں غالب کا ایسا کلام بھی موجود تھا جو انھوں نے طباعت کے لیے اپنا دیوان منتخب کرتے وقت حذف کر دیا تھا۔ ۱۹۲۱ع میں جب اس نسخے کو متداول کلام کی شمولیت کے ساتھ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے شائع کیا گیا، تو پہلی بار غالب شناس اس محذوف کلام سے متعارف ہوئے۔ یہ مخطوطہ غالباً ۱۹۴۸ع

۱- کچھ عرصہ قبل تک اس نسخے کو سب سے قدیم نسخہ خیال کیا جاتا تھا، لیکن اپریل ۱۹۶۹ع میں امروہے کے ایک قلمی کتابوں کے تاجر توفیق احمد کے پاس دیوان غالب کا ایک ایسا نسخہ دریافت ہوا ہے جسے کہا جاتا ہے کہ غالب نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے۔ مخطوطے پر ترقیمے کے طور پر یہ عبارت درج ہے مگر اس میں سنہ نہیں لکھا گیا: ''تمت تمام شد۔ بتاریخ چہاردہم رجب‌المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقیماندہ فقیر بیدل اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بہ جناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد۔ فقط''۔ جناب نثار احمد فاروقی کے قیاس کے مطابق یہ نسخہ ۱۸۲۰ع کے قریب تحریر کیا گیا ہے (''دیوان غالب کا ایک اہم ترین مخطوطہ''، ہماری زبان علی گڑھ، ۲۲ اپریل ۱۹۶۹ع، ص ۲۔ مزید ملاحظہ فرمائیے، مراسلہ بعنوان ''دیوان اردو بقلم مرزا غالب'' از جلال‌الدین، روزنامہ قومی آواز، لکھنؤ، ۱۶ اپریل ۱۹۶۹ع ص ۳)۔

تک بھوپال میں محفوظ رہا ، لیکن ریاست کے ہند یونین میں انضام کے بعد زبردست تبدیلیاں آئیں اور جب حمیدیہ لائبریری کی وہ عمارت جہاں یہ مخطوطہ تھا ، خالی کرائی گئی ، شاید اُس وقت افراتفری میں یہ نسخہ کہیں ضائع ہو گیا ۔ اصل نسخے کی غیر موجودگی میں اس کی کیفیت کا اندازہ کرنے کا واحد ذریعہ وہ تفصیلات ہیں جو ایسے حضرات نے بیان کی ہیں جنھوں نے اس نسخے کو دیکھا ہے ۔ ان حضرات میں مفتی محمد انوارالحق ، ڈاکٹر سید عبداللطیف اور جناب امتیاز علی عرشی شامل ہیں ۔ مفتی انوارالحق نے اصل نسخے کی مدد سے ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتب کیا اور اس کی تمہید میں مختصراً مخطوطے کی کیفیت بیان کی ہے[1]۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف غالب کے دیوان کو تاریخی ترتیب کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اس مخطوطے کو سر اکبر حیدری کی سفارش سے انھوں نے حیدر آباد منگوایا تھا اور اپنے ایک مضمون میں جو ''مسلم ریویو'' کلکتہ میں جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ، مخطوطے کے بارے میں بعض اہم تفصیلات درج کی ہیں[2]۔ جناب امتیاز علی عرشی غالباً ۱۹۰۲ء میں بھوپال آئے تھے اور یہاں دو دن قیام کر کے انھوں نے اس مخطوطے کو دیکھا اور اس کے بارے میں جو معلومات یکجا کیں ، انھیں اپنے مرتب کیے ہوئے دیوان غالب (نسخۂ عرشی) میں شامل کیا ہے[3]۔

ان بیانات میں مخطوطے کی کتابت اور اس میں موجود اصلاحات اور اضافوں کی کیفیت کے علاوہ ایسی تفصیلات بھی شامل ہیں جن کا کلام غالب سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے ۔ لیکن تحقیق و تفتیش کے میدان میں کبھی کبھی ایسی الحاق تفصیلات سے بھی بعض کار آمد نتائج اخذ کرنے میں مدد ملتی ہے ۔ چنانچہ اسی توقع کے ساتھ ان تفصیلات سے اس مضمون میں بحث کی جاتی ہے ۔

مفتی انوارالحق ، ڈاکٹر عبداللطیف اور عرشی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ مخطوطے کے اندر جابجا فوجدار محمد خاں کی ایسی مُہریں ثبت ہیں جن پر ۱۲۳۸ھ

۱- نسخۂ حمیدیہ ، تمہید ص ۵ تا ۸ ۔

۲- اس انگریزی مضمون کا ترجمہ جناب سید محمد نے کیا تھا جو کہ مجلہ مکتبہ (حیدر آباد) کے شمارہ ۶ جلد ۲ میں صفحات ۵۳ تا ۵۷ پر ''دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ'' کے عنوان سے شائع ہوا ۔ زیر نظر مضمون میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کے مضمون کے سارے حوالے اسی ترجمے سے ماخوذ ہیں ۔

۳- نسخۂ عرشی ، دیباچہ ص ۷۵ تا ۷۸ ۔

کندہ ہے ۔ لیکن مخطوطے کے شروع اور آخر میں ایسے اوراق پر جو بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں ، ۱۲۶۱ھ کی مُہر ثبت ہے ۔ مُہروں کے علاوہ مخطوطے پر بعض دستخطوں کی موجودگی کا بھی علم ہوتا ہے ۔ عرشی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحب ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے ۔ انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگیٔ اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے ''۔ بعض شعروں کے سامنے ''پسند عبدالعلی'' یا ''پسند خاطر عبدالعلی'' بھی درج ہے[1]۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے بھی ان دستخطوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور نسخے کے حاشیوں پر اضافوں کو دو مختلف خطوں میں بتاتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں ، اسی خط میں عبدالعلی کا نام لکھا ہے[2]''۔ عرشی صاحب نے مخطوطے کے ورق ۹۲ الف کے حاشیے میں باریکے کے اندر محمد عبدالصمد مظہر کے دستخطوں کا ذکر کیا ہے[3] اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نسخہ عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہنچا ہے[4]۔ ڈاکٹر عبداللطیف اپنے مضمون میں مظہر کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے لیکن یہ بتاتے ہیں کہ متن کی ابتدا سے قبل شامل سادہ اوراق میں سے ورق ۱ الف پر نمبرات کے علاوہ شکستہ خط میں ''محمد حسین'' لکھا ہوا ہے اور نسخے میں حاشیوں پر خط شکستہ میں جو اضافے ہیں وہ انھیں دستخطوں سے مشابہت رکھتے ہیں ۔[5]

قلمی نسخے پر ثبت مہروں کی وجہ سے بھی بعض محققین کو کچھ غلط فہمیاں ہوئی ہیں ۔ مثلاً مفتی انوارالحق نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی تمہید میں لکھا ہے کہ ''تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا[6] ۔'' مفتی صاحب نے مزید تحریر کیا ہے : ''جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں صاحب

۱۔ نسخۂ عرشی : دیباچہ ص ۷۷ ۔
۲۔ ''دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ'' مترجمہ جناب سید محمد ، مجلۂ مکتبہ (حیدر آباد) جلد ۲ شمارہ ۶ ، ص ۵۷ ۔
۳۔ نسخۂ عرشی : دیباچہ ، ص ۷۷۔
۴۔ نسخۂ عرشی : دیباچہ ص ۷۸ ۔
۵۔ مضمون ڈاکٹر عبداللطیف مترجمہ جناب سید محمد مذکورہ بالا ، ص ۵۶ ۔
۶۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' ، تمہید ، ص ٦۔

کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ کی ہیں - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں -''[1] جناب غلام رسول مہر نے مفتی صاحب کے غالباً اسی بیان سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مفتی صاحب کے ارشاد کے مطابق دیوان ۱۸۳۲ع اور ۱۸۴۴ع میں تصحیح و اضافہ کے لیے باہر گیا[2] -'' بعض محققین نے ۱۲۴۸ھ کی مہر کو دیکھ کر مخطوطے کے کتب خانۂ فوجدار محمد خاں میں داخلے کی بالکل صحیح تاریخ اسی سال کو تسلیم کر لیا ہے - مثلاً ڈاکٹر گیان چند اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ''چونکہ فوجدار محمد خاں اہل ثروت تھے اس لیے . . . وہ سال بہ سال نئی مہر بنواتے ہوں گے ، اور متن کی مہر یہ ظاہر کرتی ہے کہ مخطوطہ پہلی بار ۱۲۴۸ھ میں کتب خانے میں آیا اور اس پر اس سال کی مہر لگا دی گئی[3]''- لیکن اصل صورت ان قیاسات سے مختلف معلوم ہوتی ہے - نہ تو (بقول مفتی انوارالحق) یہ مہریں اس کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ خاص فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا ، نہ (غلام رسول مہر کے قیاس کے مطابق) ان مہروں کو مفتی صاحب نے اصلاحات کے سنہ سے مطابقت دی ہے اور نہ (بقول ڈاکٹر گیان چند) یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ فوجدار محمد خاں ہر سال مہریں بنواتے ہوں اور ۱۲۴۸ھ کی مہر نسخے کی کتب خانۂ فوجدار محمد خاں میں داخلے کی صحیح صحیح تاریخ بتاتی ہے -

بھوپال کی مولانا آزاد سنٹرل لائبریری میں اب بھی کتب خانۂ فوجدار محمد خاں کی کئی قلمی اور مطبوعہ کتابیں موجود ہیں اور ان پر مہریں ثبت ہیں - ان کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۸ھ کی مہر چھوٹی ہے اور ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر ہے - بڑی مہر اس کتب خانے کی تقریباً ساری کتابوں پر لگی ہوئی ہے - چھوٹی مہریں البتہ مختلف سنوں کی ہیں - ۱۲۴۸ھ کے علاوہ ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کی مہریں بھی دیکھنے میں آتی ہیں - اور ایسی کتابوں کی تعداد مقابلۃً زیادہ ہے جن پر ۱۲۵۵ھ کی مہر ہے - اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مہریں ہر سال نہیں بنی ہیں اور ۱۲۴۸ھ کے بعد ۱۲۵۵ھ کی مہر بنائی گئی ہے - جہاں تک

۱- نسخۂ حمیدیہ ، تمہید ، ص ٦ -

۲- ''غالب'' (۱۹۴۴ع ایڈیشن) ، ص ۳۵۸-

۳- 'نسخۂ عرشی ، طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات (تتمہ)''، نقوش 'غالب نمبر' فروری ۱۹۶۹ع ، ص ۲۰۷ ، ۲۰۸-

۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر کا تعلق ہے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اسی سال سکندر بیگم کے بیوہ ہونے اور ان کی نابالغ صاحبزادی شاہجہان بیگم کے رئیسہ بھوپال نامزد ہونے کی صورت میں فوجدار محمد خاں نے مختار ریاست (ریجنٹ) کا کام سنبھالا تھا[1] اور دستاویزات وغیرہ پر ثبت کرنے کے لیے بڑی مہر بنوائی گئی تھی - اسی سال یا اس کے بعد فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی تنظیم ہوئی اور کتابوں کی جلد بندی وغیرہ کروا کے ان پر کتب خانے کے اندراجات کیے گئے اور ان پر ۱۲۶۱ھ کی مہریں لگوائی گئیں - یہی مہر بعد تک استعمال کی گئی کیونکہ وہ چند ایسی کتابوں پر بھی ثبت ہے جو ۱۲۶۱ھ کے بعد کی لکھی یا چھپی ہوئی ہیں ، یا جن پر اندر ۱۲۴۸ھ کی چھوٹی مہر لگی ہوئی ہے -

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان غالب کا قلمی نسخہ فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۰ ع اور ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ع کے درمیان کسی وقت آیا تھا - اور چونکہ ان سات سالوں کے دوران کوئی دوسری مہر تیار نہیں کی گئی اس لیے ۱۲۴۸ھ کی مہر ہی کو استعمال کیا جاتا رہا - ۱۲۶۱ھ میں کتب خانے کی تنظیم کے وقت ، جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بتایا ہے ، متن سے پہلے چار ورقوں میں اوراق ۳ اور ۴ کے درمیان دو انگریزی کاغذ کے ورق (جو اصل نسخے کے کاغذ سے مختلف ہیں) چسپاں کیے گئے اور ان پر کتب خانے کا اندراج کیا گیا اور ۱۲۶۱ھ کی مہر لگائی گئی - اسی طرح ترقیمے کے بعد موجود چار اوراق میں اوراق ۲ و ۳ کے درمیان دو نئے ورق لگائے گئے اور ان پر ۱۲۶۱ھ کی مہر ثبت ہے[2]- ان تفصیلات سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ متن سے قبل نسخے میں جو غیر منقوط فارسی خط نقل کیا گیا ہے اور ترقیمے کے بعد کے اوراق میں جو اضافے ملتے ہیں وہ اصل نسخے ہی کے کاغذ پر ہیں اور انہیں مخطوطے کی جلد بندی کے وقت شامل نہیں کیا گیا ہے -[3]

جہاں تک دستخطوں کا تعلق ہے ، عرشی صاحب کا خیال ہے کہ عبدالعلی ، خاندان ریاست رام پور کے ایک فرد عبدالعلی خاں ابن غلام محمد خاں صدر الصدور

۱- تاج الاقبال ، تاریخ ریاست بھوپال از شاہجہاں بیگم (فارسی) دفتر دوم ، ص ۳ -

۲- مضمون ڈاکٹر عبداللطیف مذکورہ بالا ، ص ۵۵ و ۵۶ -

۳- ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون محولہ بالا میں اس شک کا اظہار کیا ہے کہ ترقیمے کے بعد درج شدہ غزلیں ۱۲۶۱ھ کے بعد اضافہ کی گئی ہوں گی کیونکہ اس وقت تک غالب کا دیوان چھپ چکا تھا - نقوش غالب نمبر ، ص ۲۰۸ -

میرٹھ کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے غالب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں[1] - لیکن بھوپال میں بھی اس نام کے دو صاحب حیثیت حضرات گزرے ہیں - ان میں سے ایک سید محمد عبدالعلی خاں رضوی تھے اور دوسرے عبدالعلی تونگر -

اول الذکر ، قاضی سید امجد علی رضوی کے صاحبزادے تھے - قاضی صاحب پہلے اندور ریزیڈنٹی میں میر منشی تھے - ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ع میں بھوپال آئے اور یہیں ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ع میں انتقال کیا[2] - عبدالعلی غالباً ۱۸۳۶ع میں پیدا ہوئے[3] - پہلے سیہور میں اور پھر بھوپال میں تعلیم حاصل کی - ملازمت ریاست کی ابتدا تحصیل داری کے عہدے سے ہوئی - بعد میں نائب ناظم ، ناظم ، مہتمم تحقیقات امثلہ ماضیہ کے عہدوں پر درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے مدارالمہام کے عہدے پر فائز ہوئے - ۱۳۰۰ھ/۸۳-۱۸۸۲ع میں وکیل ریاست کے علاوہ ریاست کے نائب دوم بھی مقرر ہوئے اور انھیں ''خان'' کا خطاب عطا ہوا[4] - ۱۸۸۶ع میں نائب وزیر دیوانی مقرر ہوئے اور ۱۸۸۹ع میں نائب وزیر دیوانی و فوجداری اور ۱۸۹۱ع میں مہتمم دفتر حضور (اکاؤنٹنٹ جنرل) تھے[5] - سید عبدالعلی کبھی کبھی شعر بھی موزوں کرتے تھے - مولف آثارالشعرا نے ان کے ایک قطعۂ تاریخ کو نقل کیا ہے جو انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی عربی تفسیر ''فتح البیان'' پر لکھا تھا[6] -

لیکن گمان غالب یہ ہے کہ جن عبدالعلی نے مخطوطے پر دستخط کیے ہیں وہ عبدالعلی تونگر تھے - تونگر ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ع میں پیدا ہوئے[7] - ان کے والد سید عبدالواحد خاں مسکین خیر آباد کے رہنے والے تھے - بسلسلۂ تلاش معاش کچھ عرصے آگرے میں رہے[8] - بعد میں دہلی آئے اور حکیم مومن خاں مومن کے

۱- نسخۂ عرشی ، دیباچہ ، حاشیہ ص ۷۷ -
۲- آثارالشعرا ، از ممتاز علی ، ص ۱۵۲ و ۱۵۳ -
۳- عبدالعلی نے اپنے ایک بیان مورخہ ۳ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ میں اپنی عمر تخمیناً ۷۵ سال بتائی ہے - ''فیصلہ مورخہ ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۹۴ع پمفلٹ کے معاملات پر'' ، ص ۳۹ -
۴- آثارالشعرا ، از ممتاز علی ، ص ۱۵۳ و ۱۵۴ -
۵- تزک سلطانی ، از سلطان جہاں بیگم ، ص ۲۸۷ و ۳۰۴ -
۶- آثارالشعرا ، از ممتاز علی میں ۱۵۴ و ۱۵۵ -
۷- مطابق قطعۂ تاریخ مشمولہ ''دیوان مسکین'' ص ۲۱۵ و ۲۱۶ -
۸- عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) از میر محمد خاں سرور ، ص ۶۷۷ -

شاگرد ہوئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ان کا ربط ضبط پیدا ہوا ۔ چنانچہ شیفتہ نے ''گلشن بیخار'' میں تحریر کیا ہے :

''جوانے حریف و ظریف است ، ہنگام ورود دہلی سخن کہ می گفت بر مومن خاں میخواند و نیز با فقیر ربطے پیدا کردہ بود[۱]''۔

بعد میں مسکین اندور پہنچے ۔ وہاں سے ۱۸۲۸ع کے قریب بھوپال آئے کیونکہ ان کے دیوان میں دیوان ریاست حکیم شہزاد مسیح کی والدہ کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ شامل ہے جس سے ۱۸۲۸ع برآمد ہوتا ہے[۲] ۔ یہاں مسکین رئیس وقت جہانگیر محمد خاں کے مصاحب ہوئے[۳] ۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ع میں انھوں نے بھوپال میں انتقال کیا[۴]۔ مسکین پُر گو شاعر تھے اور اس عہد کے تقریباً ہر تذکرے میں ان کا ذکر موجود ہے (ملاحظہ فرمائیے گلشن بیخار ، ص ۱۷۶ ۔ عمدۂ منتخبہ از میر محمد خاں سرور مطبوعہ دہلی یونیورسٹی ، ص ۶۷۷ ۔ سخن شعرا از عبدالغفور نساخ ، ص ۴۳۳ ۔ طبقات الشعرائے ہند از کریم الدین ، ص ۳۸۵ ۔ فہرست شعرا مرتبہ اشپرنگر مترجمہ طفیل احمد بعنوان ''یادگار شعرا'' ص ۱۸۴ ۔ صبح گلشن از سید علی حسن خاں ، ص ۴۰۷ ۔ آثار الشعرا از سید ممتاز علی ، ص ۲۰۶ ۔ تذکرۂ فرح بخش از یار محمد خاں شوکت ، ص ۴۵ ۔ نور دیدہ (قلمی) از محمد عباس رفعت ، ص ۶۴) ۔ ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ع میں ان کا دیوان بھوپال کے مطبع سکندری میں طبع ہوا اور ربیع الاول ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ع میں ان کی مثنوی چشمۂ شیریں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوئی ۔ اس کے علاوہ ''تالیف الامان'' کے عنوان سے انھوں نے ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ع میں پند و نصائح پر مشتمل ایک رسالہ نثر میں بھی تحریر کیا تھا جس کا قلمی نسخہ بھوپال کی مولانا آزاد سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے ۔

عبدالعلی تونگر شعر گوئی میں اپنے والد کے شاگرد تھے[۵] ۔ نواب سکندر بیگم کے عہد میں میر دبیر ریاست رہے ۔ ۱۸۶۸ع میں سکندر بیگم کے انتقال کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کے دور میں ان کے اثر و حیثیت میں مزید اضافہ ہوا اور

۱۔ گلشن بیخار ، ص ۱۷۶ ۔

۲۔ مصرعہ تاریخ : ''ہائے مریم بزیر خاک رفت'' (کذا) ، دیوان مسکین ، ص ۲۱۷ ۔

۳۔ صبح گلشن ، از سید علی حسن خاں ، ص ۴۰۷ ۔

۴۔ تذکرۂ فرح بخش ، از یار محمد خاں شوکت ، ص ۴۵ ۔

۵۔ آثارالشعرا ، از ممتاز علی ، ص ۳۶ ۔

کہا جاتا ہے کہ انھیں ریاست کے سپید و سیاہ کا اختیار حاصل ہو گیا[1] ۔ لیکن ۱۲۷۶ھ میں جب نواب شاہجہاں بیگم ڈیوک آف ایڈنبرا سے ملاقات کر کے کلکتے سے واپس آئیں تو اس وقت بعض کارکنان ریاست نے عبدالعلی کے خلاف مزاج متغیر کرا دیا اور میر دبیر کی جانب سے طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کروا دیں ۔ چنانچہ ان کے خلاف الزامات کی تحقیقات کی ابتدا ہوئی[2] ۔ بعد میں ان پر سحر سازی اور عملیاتِ سفلی میں دلچسپی کا بھی الزام لگایا گیا[3] اور بالآخر انھیں ملازمت سے بر طرف کر کے ۱۳ شعبان ۱۲۸۷ھ/ ۸ نومبر ۱۸۷۰ع کو ریاست سے خارج کیا گیا[4] ۔ اور ان کے بعد مولوی صدیق حسن خاں میر دبیر ریاست ہوئے جنھوں نے بعد میں نواب شاہجہاں بیگم سے نکاح کیا ۔ تونگر نے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۳ع میں بمقام اندور وفات پائی[5] ۔ کہا جاتا ہے کہ تونگر اپنے زمانے کے ممتاز شعرا میں سے تھے اور ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا[6] ۔ لیکن چونکہ وہ بالآخر معتوب کر کے بھوپال سے نکالے گئے تھے ، اس لیے اس عہد کے تذکرے خاص طور پر وہ تذکرے جو نواب صدیق حسن خاں کے زیر اہتمام تیار ہوئے ان کے بارے میں بالکل خاموش ہیں اور سوائے چار چھ اشعار کے ان کا نمونۂ کلام بھی دستیاب نہیں ہوتا ۔

عبدالعلی نام کے ان دو اصحاب کو اگر دیوان غالب کے اس قلمی نسخے کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ دستخط سید عبدالعلی رضوی کے ہیں تو انھوں نے یہ نسخہ فوج دار محمد خاں کے کتب خانے ہی سے لے کر دیکھا ہے ۔ لیکن اگر دستخط عبدالعلی تونگر کے ہیں تو یہ امکان ہو سکتا ہے کہ یہ دیوان فوج دار محمد خاں کے پاس پہنچنے سے پہلے ان کے زیر مطالعہ رہ چکا ہو ۔ بلکہ ایک قیاس یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ دیوان تونگر کے والد

۱- تاریخ اُلکہ ، از سید مہدی علی سہسوانی ، ص ۷۰ ۔
۲- تاریخ اُلکہ ، از سید مہدی علی سہسوانی ، ص ۱۰۱ ۔
۳- تذکرۂ فرح بخش ، از یار محمد خاں شوکت ، ص ۸۳ ۔ آثارالشعرا از ممتاز علی ، ص ۳۶ ۔ خمخانۂ جاوید (جلد دوم) از لالہ سری رام ، ص ۱۵۸ ۔
۴- قلمی بیاض ، از مولانا محمد عباس رفعت (مملوکہ کتاب گھر بھوپال) ۔
۵- آثارالشعرا ، از ممتاز علی ، ص ۳۶ ۔
۶- ''اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' از ڈاکٹر سلیم حامد رضوی ، ص ۱۳۷ ۔

مسکین ہی بھوپال لائے ہوں - میر محمد خاں سرور مولف عمدۂ منتخبہ ، یعنی تذکرہ سرور نے مسکین کو ''شخص ذی عزت و بسیار خلیق'' لکھا ہے[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسکین اپنے عہد کے با مذاق اصحاب سے اچھے مراسم رکھتے تھے - دہلی کے قیام کے دوران انھوں نے مومن کی شاگردی اختیار کی اور شیفتہ سے بھی انھوں نے دوستانہ تعلقات پیدا کیے - ہو سکتا ہے کہ شیفتہ کی وساطت سے یا کسی اور وسیلے سے مسکین اس قلمی نسخے کو حاصل کر سکے ہوں - یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ غالب کے پاس اُس قلمی نسخے کی کتابت کے وقت تک رہا ہے جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور ''نسخۂ شیرانی'' کے نام سے موسوم ہے - ''نسخۂ شیروانی'' کی تقریبی تاریخ کتابت ۱۸۲۶ع بیان کی جاتی ہے - اس لحاظ سے یہ امکان ہے کہ ۱۸۲۸ع کے قریب بھوپال پہنچنے سے پہلے مسکین ''نسخۂ بھوپال'' حاصل کر چکے تھے - نسخے پر عبدالعلی کا اظہار پسندیدگی اور ان کے دستخط یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ نسخہ مسکین کے پاس اس وقت تک رہا ہے جب تک تونگر سنِ شعور تک پہنچ گئے اور اس کے اہل ہو گئے کہ اشعار کو منتخب کرکے ان پر نشانات لگائیں اور ان پر رائے لکھیں (ان رایوں کو ڈاکٹر عبداللطیف نے ''طفلانہ'' کہا ہے[2]) جیسا کہ نسخوں پر ثبت مہروں کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ نسخہ فوج دار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ع اور ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ع کے درمیان کسی وقت آیا - اب اگر عبدالعلی تونگر (ولادت ۱۲۳۶ع) کی عمر کو اور ان کے سن شعور تک پہنچنے کو پیش نظر رکھا جائے تو اس نسخے کے تونگر یا مسکین سے جدا ہونے اور فوج دار محمد خاں کے پاس پہنچنے کی تاریخ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ع کے قریب پہنچ جائے گی -

نسخۂ بھوپال پر عرشی صاحب کے قول کے مطابق دوسرے دستخط محمد عبدالصمد مظہر کے ہیں اور ان کے لیے یہ صاحب انجان ہیں[3] - لیکن عبدالصمد مظہر بھوپال کے معززین میں سے تھے اور عرصے تک والیۂ ریاست نواب سلطان جہاں بیگم کے سلٹری سیکرٹری رہے - مظہر ۲۲ دسمبر ۱۸۸۳ع کو کوئٹہ میں بیدا ہوئے - علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی

۱- عمدۂ منتخبہ ، ص ۶۷۷ -

۲- مضمون ڈاکٹر عبداللطیف مذکورہ بالا ، ص ۵۷ -

۳- نسخۂ عرشی ، ص ۷۷ -

سے بی - اے کیا[۱] - ۲۶ مئی ۱۹۰۶ع کو نواب زادہ محمد عبیداللہ خاں ، کرنل انچیف کے ملٹری سیکرٹری کی حیثیت سے ریاست بھوپال میں ملازم ہوئے[۲] - بعد میں ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ع سے نواب سلطان جہاں بیگم کے ملٹری سکرٹری مقرر ہوئے[۳] - ۱۴ اگست ۱۹۱۸ع سے پولٹیکل سکرٹری دربار اور وکیل ریاست کے عہدہ پر فائز ہوئے[۴] - ۱۹۲۲ع میں سر علی امام نے انھیں حیدر آباد بلایا اور وہاں ۵ اپریل ۱۹۳۲ع کو بحیثیت معتمد حرفت و تجارت ان کا تقرر ہوا[۵] - بعد میں ۱۹۲۷ع سے معتمد فوج کے منصب پر فائز رہے اور نواب صمد یار جنگ کا خطاب پایا[۶] - ۱۹۴۱ع میں معتمد دفاع مقرر ہوئے اور اسی زمانے میں برنس آف برار کے کنٹرولر بھی رہے[۷] - ۱۷ جنوری ۱۹۶۱ع کو انھوں نے وفات پائی[۸] - عبدالصمد مظہر کو علم و ادب سے گہرا شغف تھا - ان کا مطالعہ وسیع اور حافظہ حیرت انگیز تھا - نہ صرف انگریزی ، فرانسیسی ، اردو ، فارسی اور پشتو زبانوں سے انھیں اچھی واقفیت تھی بلکہ ان زبانوں کے شعر و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا - شہنشاہ حسین رضوی نے ''دیوان ثاقب'' کے مقدمے میں اگست ۱۹۱۸ع میں ثاقب لکھنوی کی بھوپال میں آمد اور مظہر کی ان کے کلام سے گرویدگی کا اظہار کیا ہے[۹] - اسی طرح مظہر حیدر آباد کی فرنچ سوسائٹی اور انگلش پوئٹری سوسائٹی کے سرگرم ممبر تھے[۱۰] - تاریخ ، خصوصاً ہندوستانی اور اسلامی تاریخ سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی اور حیدر آباد کے سہ ماہی انگریزی رسالے ''اسلامک

۱- اسٹار ڈائریکٹری مملکت حیدر آباد دکن ، ص ۵۰۲ -
۲- اختر الاقبال ، از سلطان جہاں بیگم ، ص ۱۰ -
۳- سول لسٹ عہدہ داران مندرجہ جریدہ ریاست بھوپال ، بابت شمشاہی دوم لغایت آخر دسمبر ۱۹۱۷ع ، ص ۱۴ -
۴- تذکرہ سالانہ ریاست بھوپال ، بابت ۱۸-۱۹۱۷ع ، ص ۱۳۱ -
۵- لسٹ آف لیڈنگ آفیشلس ، نوبلس اینڈ پرسونیجیز ، حیدر آباد ریزیڈنسی گورنمنٹ پریس (۱۹۳۷ع) - ص ۲۹ -
۶- اسٹار ڈائریکٹری ، ص ۵۰۲ و ۵۰۳ -
۷- ہسٹری آف سروسز آف گزیٹڈ آفسرس آف دی حیدر آباد اسٹیٹ کیرڈ اپ ٹو مارچ ۱۹۵۰ع ، ص ۱۱۷ -
۸- ''اسلامک کلچر'' (انگریزی سہ ماہی ، حیدر آباد) اپریل ۱۹۶۱ع -
۹- دیوان ثاقب ، ص ۶۴ -
۱۰- ''اسلامک کلچر'' مذکورہ بالا -

کلچر'' کو ان کی سرپرستی حاصل تھی ۔ شعر و ادب سے اس دلچسپی کے پیش نظر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مظہر نے ''نسخۂ بھوپال'' کو دیکھا ہوگا ۔ لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ۱۹۱۸ع میں جب یہ پتا چلا کہ بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں موجود اس قلمی نسخے میں غالب کا محذوف کلام بھی شامل ہے ، اس وقت یہ نسخہ مظہر کی نظر سے گزرا ہو ۔ چونکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنے مضمون میں ان کے دستخطوں کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ اس وجہ سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۸ع کے قریب جب ڈاکٹر عبداللطیف نے اس نسخے کو حیدر آباد منگوایا ، اس وقت مظہر نے اس کو دیکھا ہو اور اس پر دستخط کیے ہوں ۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے پہلے ورق پر شکستہ خط میں جن دستخطوں کو ''محمد حسین'' پڑھا ہے ، میرا قیاس ہے کہ وہ دراصل ''محمد حنیف'' ہے ۔ قاضی محمد حنیف ، میاں فوج دار محمد خاں کے معتمد خاص اور بڑے خیر خواہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی جاگیر کے منتظم اعلیٰ بھی تھے اور ہر قسم کے مالی اور انتظامی معاملات ان ہی کے ذریعے طے پاتے تھے ۔ بھوپال کی مولانا آزاد سنٹرل لائبریری میں فوج دار محمد خاں کے ایسے خطوط کی نقول پر مشتمل نو جلدیں محفوظ ہیں جو ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کے درمیان لکھے گئے ہیں ۔ ان خطوط میں سے تقریباً نصف قاضی محمد حنیف کے نام ہیں اور ان خطوط میں نہ صرف انتظامی امور کے بارے میں ہدایات شامل ہیں بلکہ بعض خطوط میں بعض کتابوں کی فراہمی کے بارے میں بھی ان کو لکھا گیا ہے ۔ ''نسخۂ بھوپال'' پر قاضی صاحب کے دستخطوں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یا تو یہ نسخہ ان کی وساطت سے خریدا گیا ہے یا خریداری کے بعد انھوں نے اپنی ذاتی منظوری کے طور پر اس کے پہلے صفحے پر اپنے دستخط کر دیے ہیں ۔

ان مہروں اور دستخطوں کی مدد سے جو نتائج اخذ یا جو قیاسات قائم کیے جا سکتے ہیں ، وہ یہ ہیں کہ ''نسخۂ بھوپال'' جو کہ ۱۸۲۶ع کے قریب غالب سے جدا ہوا ، ۱۸۲۸ع کے قریب عبدالواحد خاں مسکین کے ساتھ بھوپال پہنچا اور ان کے پاس یہ اس وقت تک رہا جب تک ان کے صاحب زادے عبدالعلی تونگر سن شعور تک پہنچ گئے ۔ اور اس لحاظ سے ، جیسا کہ مہروں کی مدد سے قیاس کیا جا سکتا ہے ، یہ نسخہ فوج دار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۵۵ھ کی مہر تیار ہونے سے کچھ قبل پہنچ گیا تھا ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اس نسخے کی خریداری قاضی محمد حنیف کے ذریعے کی گئی ہو ۔ اس امر میں بہرحال کسی شک کی گنجائش نہیں کہ عبدالصمد مظہر نے اس نسخے کو اس کی بازیافت کے بعد ہی دیکھا اور اس لحاظ سے ''نسخۂ بھوپال'' کی کہانی میں ان کا کوئی اہم حصہ نہیں ہے ۔

مشفق خواجہ

غالب اور صفیر بلگرامی

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی سادات بلگرام میں سے تھے ۔ ان کے بزرگ آرہ ، ضلع شاہ آباد (بہار) میں آباد ہو گئے تھے ۔ والد کا نام سید عبدالحی عرف سید احمد تھا جو صاحب عالم مارہروی کے داماد تھے ۔ صاحب عالم مارہرہ کے سجادہ نشین اور غالب کے دوستوں میں سے تھے ۔ صفیر کی پیدایش اپنی ننھیال (مارہرہ) میں ۲۷ ذی عقدہ ، ۱۲۴۹ھ (۷ اپریل ، ۱۸۳۴ع) کو ہوئی ۔ تین برس کی عمر میں بلگرام گئے اور پانچویں برس میں آرہ میں اپنے باپ دادا کے پاس آ کر رہے ۔ اٹھارہ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کی ۔ فارسی میں اعلیٰ استعداد بہم پہنچائی ۔ خطاطی کی تعلیم بھی حاصل کی ۔ خط نستعلیق ، نسخ ، شفیعا ، ثلث اور غبار میں مہارت حاصل تھی ۔ شاعری کا آغاز چودھویں برس میں ہوا ۔ پہلے اپنے پھوپھا سید محمد مہدی خبیر سے اصلاح لی ، پھر لکھنؤ جا کر شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے ۔ مرثیہ گوئی سے دل چسپی ہوئی تو مرزا دبیر کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا ۔ آخر میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے ۔ صفیر نے ۱۲۶۴ھ سے ۱۲۷۰ھ تک یکے بعد دیگرے چھ تخلص (قطب ، آثم ، اثیم ، صبا ، نالاں ، احقر) اختیار کیے ۔ آخر میں صفیر تخلص کیا ۔

صفیر کا شمار اپنے عہد کے اساتذہ میں ہوتا تھا ۔ اردو ادب کی تاریخ میں وہ شاید پہلے شاعر ہیں جن کے تلامذہ کا تذکرہ (مرقع فیض ، مصنفہ سلطان مرزا سلطان ، مطبوعہ ۱۲۹۵ھ) بھی شائع ہو چکا ہے ۔ اس میں اکسٹھ شاعروں کے حالات ہیں جن میں شاد عظیم آبادی اور خواجہ فخرالدین حسین خاں سخن دہلوی جیسے ممتاز شعرا شامل ہیں ۔ اس تذکرے کی اشاعت کے بعد بھی صفیر کے شاگردوں میں خاصا اضافہ ہوا ۔

شاعری میں صفیر نے تقریباً تمام اصنافِ سخن غزل ، مرثیہ ، مثنوی اور رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی کی ۔ نثر میں بھی ان کے کئی اہم کارنامے موجود ہیں جن میں ''جلوۂ خضر'' اور ''رشحات صفیر'' خاص شہرت رکھتے ہیں ۔ صفیر کی

تصانیف کی تعداد تقریباً پچاس ہے اور ان میں نصف کے قریب تصانیف ایسی ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئیں[1] ۔

صفیر کا شمار غالب کے نامور تلامذہ میں ہوتا ہے ۔ صفیر کو بھی اپنے استاد پر فخر و ناز تھا ۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے غالب کا ذکر نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے ۔ صفیر اور غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ ہجری سے ہوتا ہے جب کہ صفیر نے غالب سے شاگردی کی درخواست کی تھی ۔ ۱۲۸۱ ہجری تک صفیر و غالب میں خط و کتابت رہی ۔ ۱۲۸۲ ہجری کے شروع میں صفیر دہلی گئے اور وہاں دو ڈھائی مہینے قیام کیا ۔ اس مدت میں انھیں غالب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ آیندہ سطور میں صفیر و غالب کے اسی تعلق کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے ۔

غالب و صفیر کی مراسلت :

صفیر کے نام غالب کے تمام خطوط صفیر کی زندگی ہی میں شائع ہوئے ۔ پہلی مرتبہ ''انشائے سبد گل'' (۱۲۸۹ھ) میں اور دوسری مرتبہ ''مرقع فیض'' (۱۲۹۵ھ) میں اور تیسری مرتبہ ''جلوۂ خضر'' جلد دوم (۱۳۰۲ھ) میں ۔ تینوں جگہ یہ خطوط مکمل صورت میں یا تمام خطوط کسی ایک کتاب میں موجود نہیں ہیں ۔ مذکورہ تینوں کتابوں کو پیش نظر رکھ کر مکاتیب غالب کے جو متون تیار کیے گئے ہیں ، وہ اُن متون سے مختلف ہیں جو مختلف رسائل اور مجموعہ ہائے مکاتیب غالب میں شامل ہیں ۔

''انشائے سبد گل'' خطوط کا مجموعہ ہے جسے صفیر کے شاگرد سید محمد ہاشم ہاشم نے مرتّب کیا ۔ ۱۲۸۹ھ میں مطبع نورالانوار آرہ سے یہ مجموعہ چھپنا شروع ہوا لیکن چند جزو چھپنے کے بعد نامکمل رہ گیا ۔ اس کے دیباچے میں مرتب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب تین فصلوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہوگی ۔ پہلی فصل میں صفیر کے بزرگوں اور استادوں کے خطوط ہوں گے ، دوسری میں دوستوں اور تیسری میں شاگردوں کے ۔ خاتمے میں اُن لوگوں کے حالات ہوں گے جن کا ذکر ان خطوط میں آیا ہے ، نیز اُن لوگوں کا احوال ہوگا جن کے نام صفیر کے خطوط لکھے گئے ۔ نامکمل ''انشائے سبد گل'' کا اب صرف ایک ہی نسخہ موجود ہے ۔

۱۔ صفیر کے حالات اور تصانیف کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''مرقع فیض'' صفحہ ۶—۸۵ ۔ جلوۂ خضر ، دوم ، صفحہ ۱۸۸ ۔ خود نوشت سوانح عمری ، سہ ماہی اردو ، جنوری ۱۹۶۶ع ۔

اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی فرد کے پاس یا کسی کتب خانے میں نہیں ہے - یہ صفحہ اول سے صفحہ ۵۲ تک ہے اور درمیان میں سے سولہ صفحات یا تو موجود نہیں ، یا ہیں تو وہ سادہ ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اجزا صرف ایک ہی طرف سے چھپ کر رہ گئے - پہلی دو فصلوں کے بیشتر خطوط ان صفحات میں آ گئے ہیں ، تیسری فصل صفحہ ۴۸ سے شروع ہوتی ہے اور اس کے صرف تین صفحات موجود ہیں (صفحہ ۵۰ و صفحہ ۵۱ خالی ہیں) - تیسری فصل چونکہ شاگردوں کے خطوط پر مشتمل ہے ، اس لیے ممکن ہے کہ شاگردوں کے نام صفیر کے خطوط اور ان کے جوابات فراہم نہ ہو سکے ہوں اور یوں یہ کتاب نامکمل رہ گئی ہو -

''انشائے سبد گل'' کی ترتیب و اشاعت میں خود صفیر بلگرامی کی کوششوں کو دخل تھا - وہ اپنے ایک شاگرد جوش منیری کے نام لکھتے ہیں :

'' . . . . بالفعل رقعات خود کہ بنام احباب و بزرگان و اعزہ نوشتہ ام مع جواب آں کہ از طرف ابنا آمدہ ، طبع می کنم - و اعانت آں از چند تلامذۂ بندہ شدہ -'' (مکتوب قلمی[1])

جوش منیری نے اس کا جو جواب دیا وہ ''مرقع فیض'' میں چھپ چکا ہے اور اس میں ''انشائے سبد گل'' کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے :

''کچھ غزل و قطعہ و رباعی بہ ذریعہ عریضہ کے ارسال کرتا ہوں ؛ امید ہے کہ پہلے اصلاح فرما کر جس قدر مناسب سمجھا جائے ، داخل انشاء سبد گل فرمایا جائے -'' (مرقع فیض ، صفحہ ۲۵)

''انشائے سبد گل'' کی پہلی فصل میں غالب کے خطوط مع جوابات صفیر موجود ہیں -

''مرقع فیض'' دوسری کتاب ہے جس میں خطوط غالب بنام صفیر ملتے ہیں - یہ صفیر کے تلامذہ کا تذکرہ ہے جسے صفیر کے ایک شاگرد نواب تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا سلطان نے لکھا تھا - یہ تذکرہ ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا تھا - اس کے خاتمے میں صفیر کے حالات ہیں - ان میں غالب کے خطوط بھی شامل

۱- صفیر کے پوتے جناب سید وصی احمد بلگرامی کے پاس صفیر کے متعلق قلمی نوادر کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جس سے راقم نے استفادہ کیا ہے - اس مقالے میں جہاں کہیں کسی مخطوطے یا غیرمطبوعہ تحریر کا ذکر آیا ہے ، وہ سید وصی احمد صاحب ہی کے پاس محفوظ ہے -

ذکر دیے گئے جن کی تمہید یہ ہے :

" . . . . جوں کہ آپ (صفیر) کے جوہر طبع کا فروغ اساتذہ پسند ہے ، اس واسطے چند فقرات ، جو حضرت غالب دہلوی علیہ الرحمۃ نے آپ کی شان میں تحریر فرمائے ہیں ، بطور استاد کے لکھے جاتے ہیں ۔"

(صفحہ ۸۲)

خطوط غالب کا تیسرا ماخذ "جلوۂ خضر" جلد دوم ہے جس میں صفیر نے اپنے استادوں کا ذکر کیا ہے ۔ اس میں غالب کا ذکر انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے :

" . . . . نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ، غالب تخلص ، عرف مرزا نوشہ ۔ میں نے حضرت غالب کی ملازمت اور شاگردی کی کیفیت جلد اول تذکرہ ھذا صفحہ ۲۲۱ میں لکھ دی ہے ۔ اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ۔ مگر اتنا لکھنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۲ھ میں محرم کے آخری مہینے میں میں حضرت غالب کی ملازمت کے لیے دہلی گیا اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا ۔ کچھ کیفیت اس کی جلد اول صفحۂ مذکور میں لکھی ہے ۔ اصلاح کی کیفیت یہ تھی کہ حضرت شاگرد کا کلام خود اپنی چشمِ مبارک سے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے اصلاح دیتے تھے ۔ چناں چہ 'رسالۂ فیض صفیر' جو تانیث و تذکیر کے باب میں ہے ، حضرت نے کئی روزوں میں خود اپنی آنکھ سے ملاحظہ فرمایا اور جا بجا اصلاح دی اور اس کی تقریظ لکھی جو 'عود ہندی' میں چھپی ہے ۔ اور کلام فارسی و اردو کی اصلاح بھی اکثر ہوا کی ہے . . . ." (صفحہ ۲۱۶)

اس کے بعد صفیر نے اپنے اصلاح شدہ کلام کے ساتھ غالب کے خطوط بھی نقل کیے ہیں ۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، صفیر و غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ھ میں ہوتا ہے ، جب کہ صفیر نے غالب سے شاگردی کی درخواست کی ۔ ۱۲۸۰ھ میں صفیر اپنے نانا صاحبِ عالم مارہروی کے پاس مارہرہ میں مقیم تھے ، وہیں سے انھوں نے غالب کو ایک خط (فارسی میں) لکھا جس پر صاحبِ عالم مارہروی اور شاہ عالم مارہروی کی سفارشی تحریریں تھیں ۔ اس سے قبل کہ اس مراسلے کی تفصیل پیش کی جائے ، یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ صفیر بلگرامی کا غالب کے نام ایک اردو مکتوب بھی ملتا ہے جس میں شاگرد بننے کی درخواست کی گئی ہے ۔ یہ مکتوب "انشائے سبد گل" (صفحہ ۱۳) میں ہے اور اس کا متن یہ ہے :

مکتوب صفیر بنام غالب (۱)

''جناب معلیٰ القاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ مدظلہ ۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نبیرۂ حضرت سید صاحب عالم صاحب و قبلہ مدظلہ کہ ناد بد اشتیاق حضوری اور آرزوے قدم بوسی رکھتا ہے ، بوسیلۂ تحریر پرتاثیر جناب نانا صاحب و قبلہ مدظلہ سلک شاگردانِ خاص میں منسلک ہوا چاہتا ہے ۔ مجھے زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں کہ میرا وسیلہ بڑا ہے ۔ ایک مخمس غزل قدسی کا نعت میں جو بالفعل کہا ہے ، ملفوف ہے ، والتسلیم ۔''

اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب لکھا گیا ۔ ''انشاے سبد گل'' میں خط کے بعد غالب کا جواب درج ہے ۔ یہ ''جوابی مکتوب'' وہی ہے جو غالب نے مثنوی ''صبح امید'' پر اصلاح دینے کے بعد لکھا تھا ۔ مرتّب ''انشاے سبد گل'' نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے غالب کے جواب کو مذکورہ مکتوب صفیر کا جواب سمجھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے صفیر کے مذکورہ بالا خط کا جواب نہیں دیا ۔ اسی وجہ سے صفیر کو صاحب عالم اور شاہ عالم کی سفارش کی ضرورت محسوس ہوئی ۔

صفیر نے مارہرہ سے غالب کے نام جو خط لکھا تھا وہ ''جلوۂ خضر'' (جلد دوم) میں شامل ہے اور اس کا متن یہ ہے :

مکتوب صفیر بنام غالب (۲)

''یزدان را از زبان بے زبانی سپاس گویم کہ آرزوی دیرینہ' ما را بچہ عنوان بر آورد و مرا بہ معرض پابوسی بزرگان بسر در آورد ۔ ستّہا حضوری جناب نانا صاحب و قبلہ حضرت مولوی سید صاحب عالم صاحب دام ظلہ' را جان داروی دلِ درد آشنا ساخت ۔ و از قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد کہ از عظیم آباد پٹنہ شانزدہ کروہ سمت مغرب است و بزرگانم بحیلۂ ریاست در آنجا طرح اقامت ریختہ اند تا قصبۂ مارہرہ کہ مولدم و مسکن جدم است ، کشاں کشاں آورد ۔

اے خدا قربان احسانت شوم
ایں چہ احسان است قربانت شوم

در آب و گِل ایں بیدل کہ نمک مذاق ریختہ اند و شور و سودا از سر بر انگیختہ از بدو شعور ہم بہ ارث آبائی و ہم بہنجار طبع آزمائی با غزل سرائی سرے دارد ۔

و سہا امکن آنچہ از دُر و خزف می یابد از بحر خیال بیروں می آرد ۔ اما
این شاہدے است شوخ و شنگ کہ در کنار کسان بمشکل جا گرم می کند ۔
نہ کہ چوں من ناکس ہوش در سر دارد ۔ ان ہم خوبی تقدیر اوست ۔
چہ کند مجبور است کہ افسونے چند از کلام بزرگان خصوصاً جناب غالب
معجز بیان یاد دارم ۔ بہزار حیلہ تا لب آغوش بیان می آرم ۔ زیادہ ازیں
عرصۂ مجال تنگ و حوصلہ فراغ ہنوز درکنار گرفتن باقی است ۔ و حصول
این مدعا دشوار تاکہ رشک نظیری و کلیم و غیرت صائب و سلیم ، ظہوری
ہنجار ، نظامی کردار ، مطلوب ہر طالب جناب نجم الدولہ ، دبیر الملک ،
نواب اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب دام ظلہ افسون تازہ
نہ برانگیزد و بہ رہنمائی این نابلد کوہ (کوچہ؟) خوش کلامی بندہ سید فرزند
احمد صفیر بلگرامی نہ برخیزد ۔ اگرچہ جائے آن بود کہ سر را منصب پا دادہ
و پا بر دوش استعجال نہادہ بدہلی رسیدمے و از گلزار زیارت حضرت غالب
علی کل غالب گل نظارہ برچیدمے ، و نالہ ہائے چند کہ از دل غم پیوند
سرزدہ اند بگوش حق نیوش رسانیدمے و از خوبی قسمت دیدمے انچہ دیدمے ،
اما دام ”کل امر مرہون باوقاتہ“ چنانم نہ بستہ کہ این راہ بر رویم
کشاید ۔ کام بخش جہانیان من ناکام را روزی و نصیب فرماید ۔ حالا بوسیلۂ
دو بزرگان باطناً خود را بحضور عالی می رسانم ۔ یکے نانا صاحب ، دوسی
جناب خال فرخ فال حضرت شاہ عالم صاحب ، بو کہ نظر توجہ دریغ
نہ شود ۔

از بزرگاں کارہا دشوار نیست

و بنا بر اظہار بے استطاعتی خود غزلے چند فارسی و اردو می رسد ، باسعان
نظر دیدہ این انگارہ را از رنگ اصلاح جلوہ تازہ دادہ سود ، و بعد ازیں نام
این گمنام در زمرۂ مستفیدان نگاشتہ آید کہ سر افتخارم بر فلک ساید ۔ فقط

و پرسیدنی ہم دارم و آن لفظ پرستان است ۔ بعضے گویند کہ این لفظ
ہندی است پری استہان ، چہ استہان مقام را گویند ۔ و بعضے برآنند کہ
استہان ہندی و پری فارسی ، ترکیب آن چگونہ واقع است ۔ دراصل پریستان
است ۔ یای پری تخفیف کردہ شد و رائے پری را کسرہ دادہ پرستان
کردند ۔ حالا از جناب اصل حقیقت می پرسم ۔“ (صفحہ ۱۷ - ۲۱۶) -

اس خط پر صاحب عالم مارہروی نے مندرجہ ذیل سفارشی سطور تحریر کیں :
”صاحب عالم غفر اللہ الاعظم سلام و دعا بہ آرزو مندی ہائے بے حد و انتہا

می رساند و این دو بیت حالیہ می خواند :

اے لعل ز اشعار تو شرمندہ گہر ہم
مشتاق تو ارباب دول ، اہل ہنر ہم
لخت جگرم را کہ صفیر است تخلص
خواہد ز تو فیض سخن آں لخت جگر ہم

والسلام ۔[۱]''

شاہ عالم نے مندرجہ ذیل سفارشی الفاظ لکھے :

''۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چہ عجب[۲]
ما بندۂ لطف تو و احسان توایم

''بحضور شفقت گنجور جناب مرزا صاحب قبلہ و کعبہ محمد اسد اللہ خان صاحب مدظلہ العالی ۔ بندہ شاہ عالم غفراللہ الاعظم کہ نیاز مند قدیم ہے ، بعد گزارش تسلیم و بندگی . . . عزیز ہمشیر زادۂ بندہ سید فرزند احمد صاحب متخلص بہ صفیر کہ فی‌الحال بہ تقریب ملازمت حضرت والد ماجد مدظلہ العالی وارد مارہرہ ہیں ، اشتیاقِ قدم بوسِ جناب بہت رکھتے ہیں ۔ اور جو محبت اور اخلاص آپ کا نسبت نانا صاحب کے اور عطوفت روز افزون

۱- یہ خط بھی ''جلوۂ خضر'' (جلد دوم ، صفحہ ۲۲۹) میں ہے ۔ لفظ ''والسلام'' ''جلوۂ خضر'' میں نہیں ہے بلکہ خط کے اصل مسودے سے لیا گیا ہے جو سید وصی احمد صاحب بلگرامی کے پاس محفوظ ہے ۔ یہ ۱۳ × ۹" تقطیع کا کاغذ ہے جس کی ایک طرف صفیر کا خط ہے ۔ خط کے دائیں حاشیے پر صاحبِ عالم کی اور بائیں حاشیے پر شاہ عالم صاحب کی تحریریں ہیں ۔ صفیر نے شاہ عالم کی تحریر جلوۂ خضر میں نقل نہیں کی ۔ یہ پہلی مرتبہ یہاں شائع ہو رہی ہے ۔ اس خط کے مسودے کی دوسری طرف صفیر کا کلام ہے ۔ غالب نے اسی پر اصلاح دے کر یہ کاغذ صفیر کو واپس کر دیا ۔ صاحبِ عالم مارہروی کا خط عبدالغفور سرور کے قلم سے ہے کیوں کہ وہ بدخطی کی وجہ سے اپنے خطوط سرور سے لکھواتے تھے اور صرف دستخط کر دیتے تھے ۔ اس طرح اس نادر دستاویز پر پانچ اہل علم (غالب ، صاحبِ عالم ، شاہ عالم ، سرور اور صفیر) کی تحریریں موجود ہیں ۔

۲- اس اقتباس میں جہاں کہیں نقطے لگائے گئے ہیں ، وہاں سے اصل مکتوب کیرم خوردہ ہے ۔

جناب کی اوپر حال میرے کے یوماً فیوماً زیادہ جانتے ہیں . . . . ہم بھی وابستگانِ دامنِ محبتِ جناب . . . . امید کہ حضور پُر نور بہ نظر کیمیا اثر سے ملاحظہ فرما کے حک و اصلاح سے کلام عزیز مذکور درست فرما دیں . . . . .۔''

صفیر نے اپنے مکتوب کے ساتھ غالب کو ایک فارسی دو غزلہ اور اردو کی دو غزلیں ارسال کی تھیں ۔ غالب نے صفیر کے فارسی خط اور فارسی غزلوں پر اصلاح دی ۔ فارسی خط پر جو اصلاح دی ، وہ خط پر بھی درج کی اور اپنے مکتوب میں اس کی تفصیل بھی لکھی ۔ اشعار پر جو اصلاحیں دیں ، وہ یہ ہیں :

۱۔ خیال روے تو اے قبلۂ نظر کردم
ز دیدنت نظر خویش بہرہور کردم

اس شعر کا پہلا مصرع یوں بنا دیا : ''خیال روے ترا قبلہ نظر کردم ۔''

۲۔ بلند شد شب ہجراں چو شعلۂ آہم
چراغ ماہ خمش گشتہ بود بر کردم

دوسرے مصرعے کی اصلاحی صورت یہ ہو گئی : ''چراغ مہ بہ فلک مردہ بود بر کردم ۔''

۳۔ مندرجہ ذیل تین اشعار غالب نے قلم زد کر دیے ۔ یہ شعر صفیر نے ''جلوۂ خضر'' میں درج نہیں کیے ۔ مکتوب سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

خوش است جامہ دریدن و دیدنِ صحرا
ز فیض دست جنوں کسب این ہنر کردم
خضر مصاحبتم در سفر تمنا داشت
ولے نہ با خودش از رشک ہم سفر کردم
بجاے خود بنشیں ، ہا سنہ بجاے دگر
بیا کہ جاے تو دل کردم و جگر کردم

صفیر نے دونوں غزلوں کے مقطعوں میں غالب کا ذکر کیا ہے :

براے حضرت غالب ز فرط شوق صفیر
ترانۂ غزلِ شایقانہ سر کردم

ز طور مشعل اشعار غالب است صفیر
چراغ این غزل فارسی کہ بر کردم

اردو کی جو دو غزلیں صفیر نے غالب کو بھیجی تھیں ، ان میں سے ایک

جس کا مطلع یہ ہے :

اے فلک روز جو پیچاں ہیں ہم
کیا خمِ کاکلِ خوباں ہیں ہم

صفیر نے ''جلوۂ خضر'' میں درج کی ہے ، لیکن دوسری غزل درج نہیں جس کا مطلع یہ ہے :

زلف کو ہم بلا سمجھتے ہیں
بیج کی بات کیا سمجھتے ہیں

یہ دونوں غزلیں پانچ پانچ شعروں کی ہیں ۔

اصلاحوں کے ساتھ غالب نے صفیر کے خط کا جو جواب لکھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔ یہ خط پہلی مرتبہ مرقع فیض (صفحہ ۸۲) میں چھپا اور دوسری مرتبہ جلوۂ خضر ، (جلد دوم صفحات ۲۲۰-۲۱) میں ۔

مکتوب غالب (۱) :

مخدوم مکرم سید فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے ۔ مجھ کو حضرت برجیس فطرت جناب حضرت صاحب عالم صاحب سے نسبت اویسی ہے ۔ غائبان حاضر کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے ۔ آپ کی طرز نگارش نظماً و نثراً درخشندگی جوہر طبع سے خبر دیتی ہے ۔ اگر آپ کی طرف سے استصلاح کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا ، باوجود خواہش خدمت کیوں نہ بجا لاؤں ؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں ۔[1] مجموع ایک ورق میں کیوں کر گنجائش پائیں ۔ ناگزیر جو اس نظم و نثر میں ہے ، اس کو عرض کرتا ہوں ۔

''بسر در آوردن'' مخل معنی ''در آوردن'' کافی ۔ ''شور در سر انگیختن'' ٹکسال باہر ''از سر انگیختن'' مناسب ۔ ''نہ برانگیزد'' و ''نہ برخیزد'' فارسیِ ہند ، ''بر نہ خزد'' و ''برنیگیزد'' فارسیِ عجم ۔''بر'' لفظ زاید اور نون مفیدِ معنیِ نفی ۔ لفظ زاید ''نا'' قبل کلمہ چاہیے ۔ ''نالہ ہا کہ از دل سر بر زدہ اند'' یعنی چہ ؟ غیر ذوی الروح بلکہ غیر ذوی العقول کی جمع کی خبر بہ صیغۂ مفرد رسم ہے ۔

''پریستان'' اصل لغت ، مخفف اس کا بہ حذف تحتانی ''پرستان'' ۔ ''پری استہان'' توہمِ محض ، مگر یہ بھی یاد رہے کہ آدم الشعراء رودگی (کذا)

۱- ''مرقع فیض'' میں یہ خط صرف یہیں تک نقل کیا گیا ہے ۔

سے فخرالمتاخرین شیخ علی حزین تک کسی کے کلام میں ''پریستان'' یا ''پرستان'' دیکھا نہیں ۔

حضرت صاحبِ عالم قبلہ کی جناب میں میرا سلام عرض کیجیے اور کہیے کہ آپ کا عطوفت نامہ اور ساتھ اس کے چودھری صاحب کا مودت نامہ پہونچا ، دونوں نگارشیں جواب طلب نہ تھیں ۔ کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا بارسل جس کا عنوان سید فرزند احمد صاحب کے نام پر ہے ، ارسال کیا ہے ۔ آپ بھی بہ نظر اصلاح مشاہدہ کیجیے گا ۔

ہاں پیر و مرشد ! فارسی کے کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ہیں یا نہیں ؟ بقول انشاء اللہ خاں :

یہ مری عمر بھر کی پونجی ہے

جناب سید فرزند احمد صاحب سے التماس ہے کہ حضرت صاحب کو سلام و پیام پہنچا کر حضرت شاہ عالم صاحب کو اور ان کے اخوان کو اور حضرت مقبول عالم کو میرا سلام کہیے گا اور جناب چودھری عبدالغفور صاحب کو سلام کہہ کر یہ فرمائیے گا کہ وہ اپنے عم نامدار اور استادِ عالی مقدار کو میرا سلام کہیں ۔ زحمتِ تبلیغِ سلام و پیام ، تقدیمِ خدمتِ اصلاح کا دست مزد ہے ۔ والسلام

نجات کا طالب غالب

یوم الخمیس ذی الحجہ ، و ۱۲ مئی سال حال ۔''

''جلوۂ خضر'' میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ خط ''دہم ذی الحجہ ، ۱۲۸۰ ہجری یوم سہ شنبہ کو'' مارہرہ میں صفیر کو ملا ۔ (تقویم کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۷ مئی ، ۱۸٦۴ع) ۔ گویا غالب نے یہ خط ۱۲ مئی ۱۸٦۴ع مطابق ۵ ذی الحجہ ۱۲۸۰ ہجری کو لکھا ۔ مولانا مہر نے خطوط غالب (صفحہ ٦۵۸) میں اس کی تاریخ ۱۲ ذی‌الحجہ درج کی ہے جو درست نہیں ۔

غالب نے مذکورہ خط ارسال کرنے سے ایک روز قبل ایک مطبوعہ کتاب کا پارسل بھی صفیر کے نام بھیجا تھا ۔ یہ مطبوعہ کتاب 'مثنوی ابر گہر بار' تھی جو صفیر کو غالب کے خط سے قبل ملی ۔ صفیر نے اس تحفے کی وصولی پر شکریے کے طور پر ''صبح امید'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ۔ یہ مثنوی ''جلوۂ خضر'' جلد دوم (صفحات ۲۳ - ۲۲۱) میں شامل ہے اور اس مقالے میں درج کی جا رہی ہے ۔ اس مثنوی کی جو نقل صفیر کے ذاتی کاغذات میں محفوظ ہے ، اس میں اور مطبوعہ مثنوی میں خاصا فرق ہے ۔ حواشی میں اس فرق کی وضاحت کر دی گئی ہے ۔ یہ مثنوی غالب نے بعدِ اصلاح صفیر کو واپس کر دی ۔ غالب کی اصلاحیں بھی

حواشی میں درج کر دی گئی ہیں ۔ ''جلوہ خضر'' میں مثنوی اس عنوان کے تحت درج کی گئی ہے : ''مثنوی صبح امید بندہ صفیر بشکریۂ ورود مثنوی 'ابر گہر بار' حضرت غالب'' قلمی مسودے میں عبارتِ آغاز یہ ہے :

''مثنوی صبح امید در شکریۂ عنایت مثنوی ابرگہربار کہ مرزا اسداللہ خاں غالب از دہلی بہ بندہ فرزند احمد صفیر بلگرامی بر ڈاک روانہ فرمودہ ۔ بہ مقام مارہرہ ضلع ایٹہ ، بتاریخ ہشتم ذی‌الحجہ ۱۲۸۰ھ ، گفتہ شد ۔''

مثنوی کے اختتام پر یہ عبارت ہے :

''بفکر دو ساعت از نصف‌النہار بمقام مارہرہ بتاریخ ہشتم ذی‌الحجہ روز یک شنبہ ۱۲۸۰ ہجری ۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی غالب کے مذکورہ خط سے (جو ۱۰ ذی الحجہ کو موصول ہوا تھا) دو روز قبل ملی تھی اور صفیر نے اسی روز ''صبح امید'' لکھی ۔ صفیر نے ''صبح امید'' غالب کو بھیجی تو اس کے ساتھ مندرجہ ذیل خط بھی تھا ۔ یہ خط ''انشاے سبد گل'' (صفحہ ۱۴) میں شامل ہے ۔

مکتوب صفیر (۳) :

''جو شکر کہ کبھی ادا نہ ہوسکے اور جو فخر کہ ذرہ کو آفتاب تک پہنچا دے ، میرے لیے اُسی کی ضرورت ہے اور اُسی کی صورت ہے یعنی آج حضرت عالی مرتبت مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب تخلص کا سرفراز نامہ معہ خریطۂ مثنوی ''ابر گہربار'' ہدیتاً مجھ کو پہنچا اور نامۂ عنبرین شمامہ سے ظاہر ہوا کہ مجھے بڑے وسیلے کے سبب اپنی شاگردی میں قبول فرمایا :

میں گرد اپنے آپ پھروں فخر سے صفیر
شاگرد مجھ کو غالبِ ذی جاہ نے کیا

خدایا مجھے وہ زبان دے جو اس کا شکر ادا کرسکے ۔ بالفعل زبانِ خامہ سے کام لوں اور ایک مثنوی شکریہ میں ''صبح امید'' نام کہہ کر بھیجوں ۔ لو صفیر تائید غیبی ہوئی ۔ دو گھنٹے میں مثنوی لکھی گئی ۔ اب جلد لفافہ کر کے دہلی کو روانہ کرو ۔''

اس مکتوب سے پہلے ''انشاے سبد گل'' میں مندرجہ ذیل تمہیدی عبارت لکھی گئی ہے :

''جواب الجواب از طرف حضرت اسنادی مع شکریہ مثنوی ابر گہر بار موسوم بہ مثنوی ''صبح امید'' کہ سابق در مطبع بابو سنت برشاد صاحب

طبع شد ۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ''جلوۂ خضر'' میں شامل ہونے سے پہلے علاحدہ طور پر بھی چھپ چکی ہے ۔ یہ مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہے ۔ مثنوی ''صبح امید'' کا متن یہ ہے :

مثنوی ''صبح امید''

زہے جلوہ زار صباح امید
کہ بہر من از شرق دہلی دمید[1]

چہ صبحے کہ صبح بناگوش حور
کند از تجلیِ او کسب نور

صباحے کہ می‌تابد از باب دل
شب او شب قدر ارباب دل

صباحے کہ مست وی اند اہل ہوش
بدنبال او خور صبوحی بدوش[2]

صباحے کہ زو گشت ہشیار مست
مکاں مست در مست دیوار مست

چو برتافت از شرق این صبح نور
پدیدار شد پیک فرخ چو ہور

بہ تارک چو خورشید تاج زرش
ببر در جنائے ضیا گسترش

ز تار شعاعی کمربند او
چو صبح تمنا شکر خند او

خرامندہ چون ساقیِ نیم مست
چو جام سیم داد ابرے بدست

چہ ابرے کہ نامش 'گہر بار' شد
چہ گوہر کہ انجم ازو خوار شد

چہ ابرے کہ بارد بکشت امید
تر و تازہ از وے بہشت امید

چہ ابرے کہ چوں زلفِ مشکین پرند
چہ قطرات در وے دل خلق بند

چہ ابرے کہ از وے شب زلف ماہ[3]
ز صبحِ بناگوش شد پردہ خواہ[4]

چہ ابرے کہ در صورت آئینہ سان
ولے پیکر خوش بمعنی نہان

چہ ابرے کہ ظاہر حو اوراق نور
بباطن ہمہ مصحف روئے حور

بیا و ببین در نوردِ ورق
روان آب حیوان چو بر رو عرق

سوادش سواد دو چشم پری
صفا ریز در پردۂ عبہری

بیاضش بیاض گلوی بتان
بشیرازہ در تار موی بتان[5]

۱- زہے نور پاشیٔ صبح اُمید کہ برمن ز دہلی افق بردمید
(مسودۂ صفیر)

۲- ''بدنبال او خور صبوحی فروش'' (اصلاحِ غالب) ۔

۳- ''چہ ابرے کزو روز گیسو سیاہ'' (اصلاحِ غالب) ۔

۴- ''ز صبح بناگوش شد باج خواہ'' (اصلاحِ غالب) ۔

۵- ''بآب و بتابے چو روے بتان'' (مسودۂ صفیر) ۔

بر اوراق صافش سواد سطور — بر آورده عنبر ز دریاے نور
نگارین کتابے چو اوراق گل — بظاہر چو جزوے بباطن چو کُل
زہے بخت فرزند احمد صفیر — شد از تیّر سعد نیرو پزیر
زہے قوت طالع غالبش[1] — کہ آمد چنین تحفہ از غالبش
چہ غالب کہ غالب بود از ازل — بنظم قصیده ، بفکر غزل
دبیر فلک مرتبت ، نجم فر — ز طبعش نظام سخن بہره ور
چہ شیرے کہ نامش نگنجد عیان — بہ بیدائی دور دور از بیان[2]
بباطن چو پرسی بگوئیم نام — اسد خود بہ الله قربش مدام
کلیم سخنور سر آستان — عصا در کف از کلک گوہر فشان
فغانی کہ جادو بیانی کند — سر کوے او پاسبانی کند
ہلالی روان و دوان در رکاب — دل فیضی از طبع او فیض یاب
نظامی بےؑ نظم سبک سخن — بود بیشکارش بہر علم و فن
بجامی سپردست میخانہ را — کہ ناظر بود دور پیمانہ را
سر چاکرانش کہ خسرو بود — شب و روز اندر تگ و دو بود
ز فردوسی اینک چہ جوئی نشان — بہ گلزار فکرش بود باغبان
ہم او را سزد این سخن گستری — کہ دارد بہر رہ شناسا وری
غلام مبینش کشود است دل — ز نازک خیالان ربود است دل
گران سنگی نغمہ ہای سبک — ز سنگیں دلان ہمچو ظرف تنک
برآرد صدائے کہ غوغا فتد — بجان آتش سنگ خارا فتد
من و وصف او اے عجب اے عجب — مگر ہم ز قولش دہم زیب لب
نویسد ہم او در بیان مثنوی[3] — بہنجار جادو بیان قوی[4]

اشعار مثنوی ابر گہربار غالب

سخن را خود آنگونہ دانم سرود — کزین نیز خوشتر توانم سرود
چہ غم گر فلک رنگم از روی برد — توانم ز خود در سخن گوی برد

۱- "زہے طالع فرخ غالبش" (مسودۂ صفیر) ۔
۲- "بہ بیدای وزن کار آگہان" (مسودۂ صفیر) ۔
۳- "سراید ہم او در بیان مثنوی" (مسودۂ صفیر).
۴- "زبانش پر از منطق پہلوی" (اصلاح غالب) ۔

نہ نالم ز پیری ، جوانم بہ رائے   ہنوزم بود طبع زور آزمائے
سخن سنج معنی طرازم ہنوز   بشیوائیِ شیوہ نازم ہنوز
بہر بذلہ کز لب فشانم چو قند   خضر ''در من قال'' گوید بلند
بدستان زنی خامہ منقار من   ہدر خون مرغ گل از خار من
توانم کہ در کارگاہ ہنر   بہ نیرویِ یزدان پیروزگر
ز ہم بگسلم پاستانی طراز   سخن را دہم جاودانی طراز
گزشت آنکہ دستان سرای کہن   ز کیخسرو و رستم آرد سخن
منم کم بود در تراز کلام   شہنشہ ، پیمبر ، سپہبد ، امام
ز فردوسیم نکتہ انگیز تر   ز مرغ سحر خوان سحر خیز تر
اگر جاے دستان سرائی بدے   رہ و رسم جادو نوائی بدے
زبان را براہش گرو کردمے   دم جنبش زخمہ نو کردمے
ہمم زخمہ از دیگران تیز تر   ہمم ساز دانش نواخیز تر
بہ آزادگی خسروی می‌کنم   بدیں پشت دانش قوی می کنم
نباشد اگر پائے دین درمیان   نہم ہفت خوان بلکہ ہفتاد خوان
ہرم از تو برتر ببال گزاف   تو سیمرغ آری و من کوہ قاف
تو سوسن فرستی بخنیا گری   مرا جنبش کلک رقص پری

بازگشت خامہ بسوے مدعا

چو خود گفت و دُر سفت پایان کار   چہ آید ز من مدح شایان کار[1]
ز دریوزہ اش انچہ من یافتم   فشاندم بپایش چو در یافتم
چہ خوش گر ز ورد کلام خوشش   ہم از بردن حرف نام خوشش
بیانم چو داد معانی دھد   زبانم ز عقد اللسانی دھد[2]
کہ نامش ہزاران اثر می دھد   ز ہمنام اویم خبر می دھد
زہے قوت بخت سعد و نکو[3]   مدد یابم از بردن نام او
ز ہمنام خویش است او را مدد   ہم نام او صد مدد از صمد

۱- ''چہ آید ز من حرف شایان کار'' (مسودۂ صفیر) ۔
اس کے بعد ایک شعر مسودے میں اضافہ ہے :
ز گفتار اویم ستائش گرش   ز اشعار اویم ستائش گرش
۲- ''بہ ہمنام او صد مدد از احد'' (مسودۂ صفیر) ۔
۳- ''خوشا من خوشا بختِ سعد و نکو'' (مسودہ صفیر) ۔

چه همنام امام طریق هدیٰ — اخ مصطفیٰؐ ، بابِ علمِ خدا
حنا بند دست مطالب هم اوست — که غالب علی کل غالب هم اوست
خدایا ز دیدار او شاد کن — دو چشم مرا حیرت آباد کن
چو این لطف عامم که خاصم شده ست — دلیل ره اختصاصم شده ست
فرستم ازین جا باو صد ثنا — دعائے فراوان و بے حد ثنا[1]
ز بهر من از داور دادگر — رسید این سعادت به مارهره در
چه مارهره رشک بهشت برین — نیاکان مارا مقام گزین[2]
بزرگے که من نبسهٔ اوستم — بود فخر دوران یزدان قسم[3]
بعلم و بعقل و به همت بلند[4] — رسد بر سر عرش او را کمند
به اسم و علم صاحب عالم است — ستاش هم صاحب عالم است[5]
ز رافت ز اقران و امثال بیش — ببین یادگار بزرگان خویش[6]
دبیرے بدرگاه او تیر چرخ — مریدان او جمله تا پیر چرخ[7]
ز غالب بود هر زمان نظم جو — که هم فنِ او هست و هم عمرِ او

۱- ''ز من صد دعا و ز من صد ثنا (مسودهٔ صفیر) -
دعا بلکه بسیار و بے حد ثنا''۔

۲- ''بزرگان ما را اقامت گزین'' (مسودهٔ صفیر) -

۳- ''ز خاصان بود هم به یزدان قسم'' (مسودهٔ صفیر) -

۴- ''بعلم و بدانش چو همت بلند'' (مسودهٔ صفیر) -

۵- بهانا که او صاحب عالم است
ولے نام او صاحب عالم است (مسودهٔ صفیر)

۶- ز صاحب دلان او به سجاده در
بود یادگار بزرگان به فر (مسودهٔ صفیر)

۷- نگارندهٔ پایه اش پیر چرخ (مسودهٔ صفیر)
یکے از مریدان او تیر چرخ

اس کے بعد یہ دو شعر زائد ہیں :

توجه به ارباب فن بیشتر
توغل به شعر و سخن بیشتر
خدایا بود ظلِ او بر سرم
بحق نبیؐ و علی از کرم

نبشتم بشکریۂ این شعر چند
صفیر از من این و ز غالب پسند[1]

مثنوی پر اصلاح دینے کے ساتھ غالب نے ایک بھی خط لکھا جو پہلی مرتبہ مکمل صورت میں ''انشاے سبد گل'' (صفحہ ۱۳) میں شامل ہوا ۔ دوسری مرتبہ ''مرقع فیض'' میں (صفحہ ۸۳-۸۲) میں نامکمل صورت میں طبع ہوا ۔ تیسری مرتبہ ''جلوۂ خضر'' (دوم ، صفحہ ۲۲۳) میں چھپا اور اس میں بھی نامکمل تھا ۔ ''مرقع فیض'' میں یہ خط ''. . . . معنوی نسبت میں چاہیے'' تک ہے اور پھر ''نجات کا طالب ، غالب ۱۲ - یوم الخمیس پنجم ذی الحجہ ، ۱۲۸۵ ھجری'' کے الفاظ درج کیے گئے ہیں ۔ ''جلوۂ خضر'' میں ''. . . یہ ریاضت کہاں'' تک کی عبارت درج کرنے کے بعد ''۱۲ غالب'' کے الفاظ بڑھا کر یہ خط ختم کر دیا گیا ہے ۔

''انشاے سبد گل'' اور ''جلوۂ خضر'' میں تاریخ نہیں لکھی گئی ۔ ''مرقع فیض'' میں تاریخ اور سنہ دونوں صریحاً غلط ہیں ۔ یہ خط ''مثنوی صبح امید'' کی اصلاح کے ساتھ آیا تھا ۔ مثنوی ۸ ذی الحجہ کو کہی گئی تھی ، اگر یہ دوسرے دن (۹ ذی الحجہ) ڈاک کے حوالے کی گئی ہو تو غالب کو چوتھے یا پانچویں روز (۱۳ یا ۱۴ ذی الحجہ) ملی ہو گی ۔ یہ خط اسی مہینے میں ۱۳ یا ۱۴ ذی الحجہ کے بعد کسی جمعرات کے دن لکھا گیا ہے ۔ تقویم کے مطابق ۱۲۸۰ھ میں ۱۹ یا ۲۶ ذی الحجہ کو جمعرات کا دن پڑتا ہے ، اس لیے یہ خط انھیں دو تاریخوں میں سے کسی ایک میں غالب نے لکھا ہوگا ۔ ''مرقع فیض'' میں ''۱۲۸۵ ہجری'' صریحاً غلط ہے ۔ اس لیے کہ ۱۲۸۵ ہجری کے ذی الحجہ کے مہینے میں غالب اس دنیا میں موجود ہی نہیں تھے ۔ شاید اسی خیال کے پیش نظر ڈاکٹر مختارالدین احمد نے جب اس خط کو چھپوایا تو اس کے ساتھ ۱۲۷۸ ہجری درج کر دیا ۔[2] لیکن یہ سنہ بھی غلط ہے ۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے ، یہ تمام خط و کتابت ۱۲۸۰ ہجری کی ہے ۔ غالب کا خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔ ''انشاے سبد گل'' ''مرقع فیض'' اور جلوۂ خضر'' میں اس خط کے متن میں کہیں کہیں لفظی اختلافات ہیں ، حواشی میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے ۔

۱- ''الٰہی شود غالبم را پسند''

۲- ''نگار'' لکھنؤ ، بابت جولائی ۱۹۵۲ع ، مقالہ ''غالب کے چند نایاب خطوط'' صفحہ ۲۶ ۔

مکتوب غالب (۳)

''مخدوم زادۂ مرتضوی دودمان سعادت و اقبال توامان مولوی سید فرزند احمد صاحب کو فقیر غالب کی دعا پہنچے - میں نے جو استصلاح اشعار میں امتثال امر کیا ہے تو اس واقعہ کو یوں سمجھ لیا ہے کہ میں جناب[1] امیرالمومنین کا بوڑھا غلام ہوں - امیر نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحب زادہ میرے سپرد کیا ہے اور حکم دیا ہے[2] کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر - ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں -
اپنے نانا صاحب کی خدمت میں میری بندگی عرض کیجیے گا - اگرچہ حضرت میرے ہم عمر ہیں مگر ان کے ابوالآباء کا غلام ہو کر سلام کیا لکھوں - مجھ کو ارادت میں ان سے نسبت اویسی ہے اور محبت بھی بے تکلف ویسی ہے جیسی اس معنوی نسبت میں چاہیے -''
''جناب صاحب زادہ ہائے مرتضوی گُہر حضرت سید عالم صاحب اور شاہ عالم صاحب اور مقبول عالم صاحب اور خورشید عالم صاحب کو دعا ہائے درویشانہ اور سلام ہائے مسنون - حضرت رفعت درجات مولوی سید محمد امیر صاحب کی جناب میں بعد . . . .[3] نیاز کے معروض ہے کہ خزف بہ زائے ہوز بے شک زبان . . . .[4] لغات عربی میں اس کا نشان پایا جانا از روئے . . . .[5] ہو گا - ہر چند زبان عجم میں اشتراک نادر ہے مگر . . .[6] نہیں جیسا کہ . . .[7] مشترک . . .[8] ہے - غالب -''

۱۲۸۱ ہجری میں صفیر نے ''بوستان خیال'' کے ترجمے ''پرستان خیال'' کی پہلی دو جلدیں شائع کیں - غالب کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے صفیر کو ایک خط لکھ کر یہ کتاب طلب کی - یہ خط پہلی مرتبہ ''انشائے سبد گل''

۱- لفظ ''جناب'' 'مرقع فیض' میں ہے ، 'جلوۂ خضر' میں نہیں ہے -
۲- الفاظ ''اور حکم دیا ہے'' جلوۂ خضر میں نہیں ہیں -
۳- ایک لفظ کرم خوردہ -
۴- چند لفظ کرم خوردہ -
۵- چند لفظ کرم خوردہ -
۶- دو لفظ کرم خوردہ -
۷- چند لفظ کرم خوردہ -
۸- دو لفظ کرم خوردہ -

(صفحہ ۴۱) میں چھپا۔ بعد میں یہ ''فیض صفیر'' (صفحہ ۸۳) میں شامل کیا گیا۔ اس میں : ''. . . . بالغ نظران ہند پر عموماً '' کے بعد ''غالب ۔ ۸ ذی قعدہ ، ۱۲۱۸ ہجری'' لکھ کر خط ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کی عبارت ''مرقع فیض'' میں نہیں ہے ۔ ''جلوۂ خضر'' (جلد دوم صفحہ ۲۲۳) میں بھی یہ خط شامل کیا گیا ہے ۔ ''جلوۂ خضر'' میں بعض جگہ لفظی اختلاف ہے ۔ ذیل میں یہ خط درج کیا جاتا ہے۔ حواشی میں اختلاف کی صراحت کی گئی ہے ۔

مکتوب غالب (۴)

''نور نظر[1] ، لخت جگر ، زبدۂ اولاد پیغمبر مولوی سید فرزند احمد[2] زاد سجدہ اس درویش گوشہ نشیں کی دعا قبول فرمائیں ۔ ''بوستان خیال'' کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک ۔ حضرت یہ آپ کا احسان عظیم ہے ، مجھ پر خصوصاً اور جمیع[3] بالغ نظرانِ ہند پر عموماً . . . .[4] (کذا) جناب میر ولایت علی صاحب سے بعد ارسال قیمت و محصول دو جلدیں مانگی ہیں ، خدا کرے وہ پارسل پہلے بھیجیں اور یہ رقعہ[5] تمھارے پاس بعد ۔ (سہر غالب ۱۲۷۸ھ) ۸ ذیقعدہ ، ۱۲۸۱ ہجری ۔''

صفیر نے غالب کے مذکورہ خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا ۔ یہ خط ''انشاے سبد گل'' (صفحات ۱۸ - ۱۵) میں شامل ہے ۔

مکتوب صفیر (۴)

''حضرت عالی مرتبت فخر المتقدمین ، استاد المتاخرین جناب معلی القاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں صاحب بہادر نظام جنگ مدظلہ العالی ۔ صفیر ژولیدہ تقریر کی تسلیم نیازِ بے انداز کے ساتھ قبول ہو ۔ نوازش نامہ بطلبِ جلد مطبوعہ ''پرستان خیال'' بنام میر ولایت علی صاحب اور میرے ، مشعرِ اشتیاقِ مالایطاق ورود پایا ۔ جو فقرہ کہ حضور

۱- جلوۂ خضر میں ''نور چشم'' ہے ۔
۲- جلوۂ خضر میں ''احمد'' کے بعد ''صاحب'' کا اضافہ ہے ۔
۳- جلوۂ خضر میں لفظ ''جمیع'' نہیں ہے ۔
۴- جلوۂ خضر میں نقطے نہیں ہیں ۔
۵- جلوۂ خضر میں سہو کتابت سے ''رقم'' لکھا گیا ہے ۔

نے نادیدہ ''پرستان خیال[1]'' کی تعریف میں لکھا ہے ، میرے افتخار اور استظہار کا باعث ہوا ۔ خداوند تعالی سلامت رکھے اور ہم شاگردان ہیچمدان ہمیشہ فیض‌یاب رہا کریں . . . .[2] روانہ ہوتے ہیں ، پہنچیں گے ۔ قیمت کی احتیاج نہیں ، ٹکٹ واپس ہوتے ہیں . . . .[3] یہاں کے لوگوں نے سنا ہے کہ حضور کو معما میں بہت دخل ہے ، اس لیے بعض دقیقہ سنج مجھ سے . . .[4] کہ تو منگا دے اور مجھے بھی اشتیاق ہے ۔ امید ہے کہ اس عنایت سے بھی ممتاز ہوں ۔ مثنوی ''صبح امید'' بہ شکریہ' مثنوی ابرگہر بار اصلاح شدہ کہ صرف دو جگہ بنائی گئی ہے ، ورود ہوئی اور قلت اصلاح پر طبیعت کو بڑا بھروسا بندھا ۔ دو تین غزلیں اردو اب بھیجی جاتی ہیں ، امید کہ جلد اصلاح سے مزین ہو کر آئیں کہ یہاں سے اور بھی جائیں ، کس لیے کہ اب غزل سرائی میں مزا نہ رہا ۔ جی میں ہے کہ آپ کی نگاہ سے اپنا سب کہا سنا گزران کر چھپوا دوں ۔ زیادہ تمنائے حضوری ہے ۔

۱۔ 'عود ہندی' میں چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحبِ عالم مارہروی کو مخاطب کر کے غالب لکھتے ہیں :

''حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکلا ، بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا ۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں ، دام پر گر کے دانا زمین پر سے اٹھاؤں ۔''

یہاں 'بوستان خیال' سے یقیناً ترجمہ' 'بوستان خیال' از صفیر بلگرامی مراد ہے ۔ ورنہ حضرت صاحبِ عالم کو ''دانہ ڈالنے'' کی کیا ضرورت تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ عالم کو صفیر نے اطلاع دی ہوگی کہ ''پرستان خیال'' کی پہلی دو جلدیں غالب کو بھیجی جا چکی ہیں ۔ صاحبِ عالم نے ان جلدوں کے بارے میں غالب کی رائے طلب کی ہوگی ۔ ''خطوط غالب'' (از مولانا مہر) اور ''عود ہندی'' (مجلس ترق ادب لاہور) میں اس خط کی تاریخ ۱۸۶۲ع لکھی گئی ہے ۔ ''پرستان خیال'' کی مذکورہ جلدیں ۸۱ - ۱۲۸۰ ہجری میں چھپیں ، اس لیے اس خط کی صحیح تاریخ ۶۵ - ۱۸۶۴ع ہو سکتی ہے ۔

۲۔ چند الفاظ کرم خوردہ ۔

۳۔ ایک لفظ کرم خوردہ ۔

۴۔ چند الفاظ کرم خوردہ ۔

رباعیات

اب ذکر شباب ہے کہانی افسوس
آگے قدر اس کی کچھ نہ جانی افسوس
لو نقشِ قدم تک نہیں ملتا ہے صفیر
کن پاؤں چلی گئی جوانی افسوس

دنیا ہے گزرگاہ خبردار رہو
تاکہ نہ کسی کا مال ہشیار رہو
اک دن دنیا کو چھوڑ دینا ہے صفیر
اپنی شے سے بھی دست بردار رہو

کم زور قدم ہیں ، بے بصر شیب میں آنکھ
داخل نہ قوا میں پاؤں ، نہ زیب میں آنکھ
حرکت ہے بے عصا و عینک دشوار
. . . .[1] پاؤں میں ہاتھ اور رکھ جیب میں آنکھ

کیا کہیے کہ طبع کیسے گھبراتی ہے
لُکنت مرے کہنے میں نہیں آتی ہے
اس عُقدے کا باعث سخنِ تر ہے صفیر
بھیگے جو گرہ اور بھی جم جاتی ہے

مے کش تھے کبھی ہم بھی جوانوں کی طرح
اب ہو گئے وہ جلسے فسانوں کی طرح
پیری میں کریں سلسلۂ سبحہ درست
پھر کاش ہوں جمع لوگ دانوں کی طرح

۱- ایک لفظ کرم خوردہ ۔

سو بار طلب نزع میں ہر چند رہی　　پر ان کی ادا وضع کی پابند رہی
. . . . کہ ہم　　آنکھیں تو کھلیں رہیں . . . . . [1]

ابیات جناب اوستادی [2]

غصے میں کیا علاج کیے دل کی ٹیس کے
بیرا کھلا دو . . . . دانتوں کو پیس کے
دونوں . . . . مرے خوش خط ہیں کس قدر
. . . . لکھے ہوئے ہیں . . . . خوشنویس کے
دیکھو شکستہ حالیِ دیوانگانِ عشق[3]*
دامن پھٹے ہیں دس کے ، گریبان بیس کے
تیغِ نگاہِ ناز کے جوہر چمک گئے*
مسی نے کھل کے رنگ دکھائے کسیس کے
جاتی رہیں صفیر وہ دقّت پسندیاں*
اب ہیں مزے پڑے ہوئے لفظِ سلیس کے

ہوا ہے دل غم ساقیٔ لاجواب میں آب
یہ شیشہ آپ ہوا حسرتِ شراب میں آب
ورق ہیں جوشش مضمونِ گریہ سے بادل***
بسانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب
میں محتسب ہی کو کوسوں گا پانی پی پی کر**
تمام عمر پیوں گا غمِ شراب میں آب
ہٹا کے کون ہوا ہے کنارے دریا سے*
کہ اپنی موج سے ہر دم ہے پیچتاب میں آب

۱- ان اشعار میں جہاں کہیں نقطے لگائے گئے ہیں ، وہاں اصل کتاب کرم خوردہ ہے ۔
۲- مراد صفیر بلگرامی ۔
۳- ان اشعار میں سے بعض پر صاد بنے ہوئے ہیں ۔ قرینہ یہ ہے کہ غالب نے یہ صاد لگائے ہیں ؛ کسی شعر پر ایک ، کسی پر دو اور کسی پر تین ۔ یہاں اسی اعتبار سے ''صاد'' کی جگہ ستارے بنا دیے گئے ہیں ۔

تمہارے عشق کی تاثیر بحر و بر میں ہے*
کہ پیچتاب میں ہے خاک، اضطراب میں آب
کبھی ہوں گرم کبھی سرد، حسب موقع وقت***
صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

آہ اب ہونٹوں پر نہیں آتی* ہائے دل کی خبر نہیں آتی
تم رلاتے ہو تو میں روتا ہوں** خود بخود آنکھ بھر نہیں آتی
کس طرح ہو گا وصل اے اللہ کوئی صورت نظر نہیں آتی
ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا*** ابھی کچھ بات کر نہیں آتی
ایک میری خبر ہے بس مفقود* شہر میں کیا خبر نہیں آتی
وہ نہ آئیں تو اختیار ہے کیا** موت بھی تو اِدھر نہیں آتی
.... ہیں وہ پھر ہم آتے ہیں نیند.............
چرخ...کچھ تو حال ہو معلوم* یوں....... خبر نہیں آتی
.... ہو حکومت ان پہ صفیر
چاہ بھی تم کو کر نہیں آتی

غالب نے صفیر کے مذکورہ خط کا جواب ۲۵ ذیقعدہ، ۱۲۸۱ ہجری کو لکھا۔ یہ خط پہلی مرتبہ ''انشائے سبد گل'' (صفحہ ۱۸) میں طبع ہوا۔ دوسری مرتبہ ''مرقع فیض'' (صفحہ ۸۳ - ۸۳) میں شامل ہوا اور آخر میں ''جلوۂ خضر'' (دوم، صفحات ۲۴ - ۲۲۳) میں چھپا۔

اس خط کا ایک حصہ ''نادر خطوط غالب'' (مرتبہ رسا ہمدانی) میں چھپا تھا۔ رسا نے یہ خط سید وصی احمد بلگرامی کے مقالے ''م ش ص'' سے لیا تھا۔ بعد میں یہ خط مکمل صورت میں ''مرقع فیض'' سے لے کر ''نگار'' لکھنؤ کے جولائی ۱۹۵۲ع کے شمارے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے چھپوایا تھا۔ مولانا مہر نے ''نادر خطوط غالب'' سے لے کر یہ نامکمل خط ''خطوط غالب'' کی طبع چہارم (صفحہ ۶۰۷) میں شامل کیا۔ ''نگار'' سے مکمل خط بھی لے لیا (خطوط غالب، صفحہ ۶۵۹) اور اس میں سے وہ عبارتیں نکال دیں جو ''نادر خطوط غالب'' میں آ چکی ہیں۔ اس طرح ''خطوط غالب'' میں اس ایک خط کے دو خط بن گئے۔

ذیل میں ''انشائے سبد گل'' سے اس خط کا متن درج کیا جاتا ہے۔ حواشی میں ''مرقعِ فیض'' اور ''جلوۂ خضر'' کے اختلافات کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔

مکتوب غالب (۵)

''بہ علاقۂ مہر و محبت نور چشم و سرور دل اور[1] برعایتِ سیادت مخدوم و مطاع مولوی سید فرزند احمد طال بقاءہ و زاہ علاءہ اس مصرع سے میرا مکنون ضمیر دریافت فرمائیں :

بندۂ شاہ شمائیم و ثناخوان شما

یا رب[2] وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معمائی سمجھتے ہیں ۔ اصلِ فطرت میں میرا ذہن[3] تاریخ و معما کے ملایم[4] نہیں پڑا ہے ۔ جوانی میں از راہ شوخیِ طبع گنتی کے تین[5] عاسیانہ معمے لکھے،[6] وہ مبادیِ کلیات فارسی میں موجود ہیں ۔ تاریخیں اگر ہیں تو مادے اوروں کے[7] اور نظم فقیر کی ہے[8] ۔ یہ کلام نہ بطریق کسر نفسی ہے ، نہ بہ سبیل اغراق ، سچ کہتا ہوں اور سچ لکھتا ہوں . . . .[9] (کذا) ۔ اس نامۂ مہر افزا کو دیکھ کر مبادیٔ ''پرستان خیال'' کی عبارت یاد آ گئی[10] ۔ افسوس ہے کہ اس ہیچ میرز کے اجزائے خطابی اس مسودے کی تسوید کے وقت

۱- جلوۂ خضر میں ''و'' بجائے ''اور ۔''

۲- یہاں سے ''حکایت ہے شکایت نہیں'' تک کی عبارت ''مرقع فیض'' میں نہیں ہے ۔

۳- جلوۂ خضر میں سہو کتابت سے ''ذہین'' لکھا گیا ہے ۔

۴- جلوۂ خضر میں ''ملایم و مناسب'' ہے ۔

۵- لفظ ''تین'' جلوۂ خضر میں نہیں ہے ۔

۶- جلوۂ خضر میں ''لکھے ہیں'' ہے ۔

۷- جلوۂ خضر میں ''کے ہیں'' ہے ۔

۸- یہاں ''جلوۂ خضر'' میں صفیر نے یہ حاشیہ دیا ہے : ''اصل حقیقت یہ ہے کہ بندۂ صفیر نے حضرت غالب کو لکھا تھا کہ پٹنہ کے لوگ آپ کے معمے اور چیستان کے مشتاق ہیں کہ ان لوگوں نے آپ کو معمے میں کامل سنا ہے ۔ اس کے جواب میں یہ عبارت حضرت غالب نے تحریر فرمائی ۔'' (جلد اول ، صفحہ ۲۲۳) ۔

۹- یہ نقطے جلوۂ خضر میں نہیں ہیں ۔

۱۰- حاشیہ از صفیر بلگرامی :

''اس کی حقیقت یہ ہے کہ میں نے خط جو حضرت غالب کو بھیجا تھا ، اس کے القاب میں حضرت کا خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

تک آپ نے نہیں سنے تھے ، ورنہ اس کے کیا معنے کہ خط میں لکھے جائیں اور کتاب میں اندراج نہ پائیں - محمد رضا برق کا خطاب معلوم تھا تو آپ نے لکھا ہے ، حکایت ہے شکایت نہیں . . . . (کذا) - پہلی جلد جس کا نام 'افق الخیال' ہے اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں - جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو ، بے طلب بھیج دیں اور معاً قیمت لکھ بھیجیں . . . .[1] اشعار گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ، سب اچھے ہیں - مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں :

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

کیوں حضرت ! ''ابھی کچھ'' کی تحتانی کا دبنا کیا غیر فصیح نہیں ؟

کچھ ابھی بات کر نہیں آتی

کیا اس کا نعم البدل نہیں ؟

ورق ہیں جوشش مضمون گریہ سے بادل
بسان ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

درّ قائل : کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسب موقع وقت
صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ و موحدانہ مضمون اور بالغانہ الفاظ -

تم سلامت رہو قیامت تک
صحت و لطف طبع روز افزوں

نجات کا طالب[2] غالب ۲ ۱

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

خان بہادر نظام جنگ بھی لکھا تھا اور پرستان خیال ترجمۂ بوستان خیال میں جو شعرا کی فہرست ہے ، اس میں یہ خطاب نہیں لکھا تھا اور محمد رضا برق کا خطاب لکھا تھا - حضرت نے جب پرستان خیال کو دیکھا تو یہ شکایت مجھے لکھی -'' (جلوۂ خضر دوم ، صفحہ ۲۲۴) -

۱- ''انشاے سبد گل'' میں اس جگہ نقطے ڈالے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ عبارت کا کچھ حصہ ترک کیا گیا ہے ، لیکن ''مرقع فیض'' میں اس قسم کی کوئی صراحت نہیں - ''جلوۂ خضر'' میں بھی اس جگہ نقطے ہیں -

۲- ''مرقع فیض'' اور ''جلوۂ خضر'' میں اس کے بعد یہ تاریخ ہے : ''شنبہ ۲۵ ذی قعدہ ، ۱۲۸۱ ہجری -''

غالب کے مذکورہ خط کی وصولی کے فوراً بعد صفیر بلگرامی نے اس کا جواب لکھا جس کا جواب الجواب غالب کی طرف سے جلد ہی آیا ۔ صفیر و غالب کے یہ خط ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ ہجری اور ہفتم ذی الحجہ ۱۲۸۱ ہجری کے درمیان لکھے گئے، کیوں کہ ان دو تاریخوں کے غالب کے دو خطوط موجود ہیں ۔ (ان میں سے ایک اوپر درج ہو چکا ہے اور دوسرا یعنی غالب کا صفیر کے نام آخری خط اس مقالے میں آگے کہیں درج ہوگا) ۔ صفیر نے غالب کے ۲۵ ذی قعدہ ، ۱۲۸۱ ہجری کے خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا ۔ یہ خط ''انشاے سبد گل'' (صفحات ۲۰—۱۸) سے نقل کیا جا رہا ہے :

مکتوب صفیر (۵) :

''قبلہ' سخن سنجان معانی شناس و کعبہ' نکتہ دانان والا اساس ! انجم . . . .[1] بلا . . . . دبیر بے نظیر فلک ابہت و کرامت جناب عالی مناقب حضرت غالب مطلوب ہر طالب مدظلہ تعالیٰ ۔ صفیر کج مج تقریر تسلیم کو ذریعہ' عبودیت اور عبودیت کو وسیلہ' عزت جان کر جو کچھ عرض کرے وہ یہ ہے ۔ نوشتہ' شفقت سرشتہ نے جس کے ہر لفظ سے شفقت کاملہ کی تراوش تھی ، ورود ہو کر سرفراز کیا ۔ گلہ سنجی حضور کی میرے سر آنکھوں پر ، اجزائے خطابی کا مبادی بوستان خیال میں نہ لکھنا بہ خدا سہواً تھا نہ عمداً تھا ۔ اب آپ ہی کے شعر کو شفیع سمجھ کر امیدوار عفو ہوں :

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

'افق الخیال' جب چھپ کر نکلے گی ، پہلے آپ کے پاس پہنچے گی ، بعد میرے پاس ، خاطر شریف مطمئن رہے . . . . (کذا) غزلیات مرسلہ پر جا بجا صاد دیکھ کر اور چند اشعار ، جو حضور کو پسند آئے ہیں ، ان کے ساتھ چند فقرہ دل چسپ ملاحظہ کر کے میں اس قدر بالیدہ ہوا جس کی شرح نہیں - خدا آپ کو سلامت رکھے . . . . (کذا) پہلے شعر مطبوعہ خاطر اقدس پر جو اصلاح ہوئی کہ :

کچھ ابھی بات کر نہیں آتی

درست ہے مگر زبان دانان لکھنؤ کے یہاں عام حروف علت آخر لفظ ہندی کا گرانا دبانا جائز ہے اور غیر زبان کے لفظ کا ناجائز ۔ مخصوص حروف علت میں الف اور یاے تحتانی پر تو ہمیشہ مار رہتی ہے ، ہاں فصحا

۱- ۔کرم خوردہ ، شاید یہاں ''انجم سپہر فصاحت و بلاغت'' کے الفاظ ہوں ۔

بہ ضرورت اور حسب موقع دباتے ہیں اور کبھی الف اور یائے تحتانی کے بعد اگر 'نون' بھی ہو ، اصلی لفظ یا جمع کے حروف میں بھی دب جاتا ہے ۔ آتش :

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

''میں'' اور ''ہوں'' کے حروف دوم اور سوم دب گئے ۔ ناسخ :

خوں رلاتا اسے ناسور بنا کر گردوں
زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

''کبھی خنداں'' بروزن[1] . . . . یائے تحتانی 'کبھی' کی دب گئی ۔ اسی طرح ''ابھی کچھ'' با[2] . . . . فعلاتن[3] . . . . زیادہ مثالیں نہ لکھیں کہ[4] . . . . سے واضح ہوں گی اور[5] . . . . بھی اس سے خالی ہیں ۔ خیال آتا ہے کہ یہ مطلع حضور کا ہے ، دیوان آپ کا اس وقت موجود نہیں :

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

''بھی تو ویراں'' فعلاتن کے وزن پر ہے ۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں ، فی الحقیقت خلاف ہے ، مگر یہ قواعد ابھی تک مخصوص فارسی و عربی ہیں ۔ اردو میں نہ تھے ، نہ ہیں ، نہ ہوں گے ۔ حضور محقق اور راغب فارسی ہیں ، یہ باتیں جی میں کھٹکتی ہوں گی ۔ خیر ہر زبانے و ہر بیانے ، اپنا اپنا اجتہاد ہے ، زیادہ کیا عرض کروں ۔

ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخرالدین صاحب سخن (جن کا دادھیال لکھنؤ اور نانھیال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں بہ عمر چاردہ پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحب زادی سے منسوب ہوئے اور مجھ سے تلمذ کیا اور قصہ مسمی بہ ''سروش سخن'' جس کو ان کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا) سب حال آپ سے بیان کیا تھا ۔ چوں کہ اس قصے کو چھپنا چاہیے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں ، اس کے سوا حضور سے

١- چند الفاظ کرم خوردہ ۔
٢- ایک لفظ کرم خوردہ ۔
٣- چند الفاظ کرم خوردہ ۔
٤- ایک لفظ کرم خوردہ ۔
٥- ایک لفظ کرم خوردہ ۔

بڑھ کر کون ہے ، اس لیے وہ قصہ بھیجتا ہے ۔ حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے ۔ اور طبیعت ان کی اچھی ہے ۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ میں اصلاح کے لیے آئی ہے ۔ اس کا ایک شعر میرے دل میں کھب گیا ، وہ یہ ہے :

سمبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اور قصہ کو جلد ملاحظہ فرما کر عنایت فرمائیے ۔''

غالب نے صفیر کے اس خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا ۔ یہ خط بھی ''انشاے سبد گل'' (صفحہ ۲۱—۲۰) میں شامل ہے :

مکتوب غالب (٦) :

''نور الابصار ، ممتاز روزگار زکی و ارشد مولوی سید فرزند احمد طال بقاءہ و زاد علاءہ اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے . . . . (کذا) آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا ، یہ سترھواں برس مجھے جاتا ہے ؛ ہائے :

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور ، دل میں سرور آیا اور قصہ 'سروش سخن' اس کے دوسرے دن پہنچا . . . . [1] ''ابھی کچھ بات کر نہیں آتی'' کا جواب باصواب پایا ۔

تم سلامت رہو قیامت تک　　صحت و زور طبع روز افزوں

مگر ایسی باتوں سے بچنا مناسب ۔ گو مجھی سے ہو . . . . .[2] شاعر پابند قواعد . . . . (کذا) کچھ قواعد حسب خواہش شاعر نہیں . . . . (کذا) مضمون بندی کا کام ہے ۔ مگر . . . .[3] قواعد شاعر نہیں کہلاتا ۔ الحمد للہ تم وقوف سے خالی نہیں . . . . (کذا) قصہ دیکھا ۔ آپ کی جوہر طبع کی لمعانی اور نیّر فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی ۔ اگرچہ وہ 'قصہ نو بچوں' کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے ۔ ہاں اگر 'فسانہ عجائب' کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کیا ہے ۔

۱۔ اصل کتاب یہاں سے کرم خوردہ ہے ، اس وجہ سے چند الفاظ ضائع ہو گئے ۔
۲۔ ایک لفظ ضائع ہو گیا ۔
۳۔ چند لفظ ضائع ہو گئے ۔

ابھی دیکھتا ہوں ، آیندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی ۔ الفاظ کی غلطی بہت پائی جاتی ہے ۔ جا بجا 'لاچار' لکھنا ہے اور 'لاجار' غلط ہے ، کس لیے کہ چار لفظ فارسی ہے اور جیم فارسی اس کی دلیل ہے ۔ اگرچہ 'لا' عربی کا حرف نفی ہے مگر فارسی کا حرف نفی ہوتے کہ حرف 'نا' ہے ، 'لا' کا لگانا کاتب کی جہالت ہے ۔ یہ قصہ آپ کے خط سے نہیں معلوم ہوتا ۔ شاید کسی کاتب سے لکھوایا ہے ۔ ہائے خدا کی مار کاتبانِ ناہنجار پر ۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا ۔ غزلیات فارسی اصلاح ہو کر جاتی ہیں ۔ لو بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں ۔ تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر ان کو چپکا بٹھا رکھا ، اور وہ بھی تم کو سلامِ اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں اور منشی صاحب بہت بہت بندگی کہتے ہیں ۔''

صفیر و غالب کے مذکورہ دونوں خطوط ''متنازعہ فیہ'' ہیں ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ صفیر کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی صاحب نے رسالہ ''ندیم'' گیا ، بہار نمبر ۱۹۳۵ع میں ''س ش ص'' کے نام سے ایک مقالہ لکھا ۔ اس میں انھوں نے صفیر کے خط کا ایک حصہ (''ملازمت'' . . . . تا . . . . ''شباب کے بدلے'') نقل کیا اور غالب کا خط بھی درج کیا ، لیکن اس کے بعض الفاظ حذف کر کے متعلقہ مقامات پر نقطے لگا دیے ۔ رسا ہمدانی نے غالب کا خط ''نادر خطوط غالب'' (کاشانۂ ادب ، لکھنؤ، ۱۹۳۹ع ، صفحات ۵۸ - ۵۷) میں نقل کیا ۔ انھوں نے یہ خط ''س ش ص'' سے لیا اور سید وصی احمد کے پیش کردہ متن سے نقطے حذف کر کے اسے مسلسل کر دیا ۔ نیز شروع میں مقام و تاریخ (دہلی ، ۲۸ نومبر ، ۱۸۶۳ع) کا اور آخر میں ''نجات کا طالب غالب'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا ۔

قاضی عبدالودود صاحب نے صفیر و غالب کے مذکورہ دونوں خطوط کو جعلی قرار دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''میں نے نادر خطوط غالب کے تبصرے میں جو معاصر پٹنہ میں شائع ہوا تھا ، موصوف (سید وصی احمد بلگرامی) سے دریافت کیا تھا کہ صفیر و غالب کے خطوط انھیں کہاں سے ملے ؟ لیکن انھوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا ۔ یہ دونوں خط میری رائے میں جعلی ہیں اور جعل سازی کی غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ سخن ، صفیر کے شاگرد تھے . . . . صفیر کے خط میں دہلی جانے اور وہاں غالب سے سخن کے متعلق گفتگو آنے کا ذکر ہے ۔ صفیر اوائل ۱۲۸۲ ہجری میں دہلی گئے ہیں ۔ . . . . اور ڈھائی مہینے ٹھہرے . . . . اس سے لازم آتا ہے کہ

خط دہلی سے واپسی کے بعد کا ہو ۔ غالب کے خط میں جو ان کی عمر کا ذکر ہے اس سے اس کا زمانۂ تحریر ۱۲۸۲ ہجری ثابت ہوتا ہے لیکن سروش سخن (قطعات تاریخ طبع اور تاریخ دتاسی جلد ۲ صفحہ ۱۷۱) ۱۲۸۱ ہجری[1] میں لکھنؤ کے مطبع نول کشور نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا ۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ یہ خط اس کے بعد لکھے گئے ہیں ۔ جعل کسی ایسے شخص نے بنایا ہے جو سروش سخن طبع اول کے سال انطباع سے ناواقف ہے ۔ اور اس بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار صفیر نہیں ۔ یہ مستبعد ہے کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں[2] ۔''

غالب و صفیر کے خطوط ''انشائے مبد کل'' میں شامل ہیں جو ۱۲۸۹ء میں چھپنی شروع ہوئی تھی ۔ یہ خطوط ظاہر ہے کہ صفیر کی زندگی میں طبع ہوئے اور جیسا کہ قاضی صاحب نے لکھا ہے صفیر سے یہ بعید ہے کہ وہ ''سروش سخن'' کی طبع اول سے واقف نہ ہوں ۔ اگر ان خطوط کو جعلی قرار دیا جائے تو اس کے ذمہ دار صفیر ہی قرار پاتے ہیں ، کوئی دوسرا نہیں ۔ لیکن صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے کو صفیر و سخن کے تعلقات کے پس منظر میں سمجھا جائے ۔

سخن ۱۲۷۵ ہجری میں آرہ میں آئے اور یہیں انھوں نے ۱۲۷۶ ہجری میں ''سروش سخن'' لکھی ۔ ابتدا میں صفیر و سخن میں نہایت خوش‌گوار تعلقات تھے جو بعد میں خراب ہو گئے ۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ''سروش سخن'' کی تالیف میں صفیر کے مشوروں کو بھی دخل تھا ۔ اسے خود سخن نے بھی تسلیم کیا ہے ، لیکن ایسے انداز میں کہ جس سے صفیر کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے ۔ (تنبیہہ صفیر بلگرامی ، صفحات ۸۹ - ۸۷) ۔ اگر سخن ہی کے بیان کو لیا جائے تو صفیر و سخن کے جھگڑے کا آغاز ''سروش سخن'' کی طباعت سے کچھ عرصے پہلے سے ہوتا ہے ۔ صاحب تنبیہہ صفیر بلگرامی کے قول کے مطابق ، صفیر نے

۱- ۳ شعبان ۱۲۸۱ ہجری تک یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی ۔ ''انشائے سبد کل'' میں ریاض الدین احمد آرزو کا ایک خط شامل ہے (صفحہ ۳۷) جس میں یہ لکھا ہے کہ منشی نول کشور یکم جنوری (۱۸۶۵ع ۔ مطابق ۳ شعبان ۱۲۸۱ ہجری) تک یہ کتاب چھاپ کر خواجہ سخن کو بھیج دیں گے ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ''سروش سخن'' اواخر ۱۲۸۱ ہجری یا اوائل ۱۲۸۲ ہجری میں طبع ہوئی ہوگی ۔

۲- آئینۂ غالب ، صفحات ۳ — ۱۰۲ ۔

''سروش سخن'' کا مسودہ صاف کیا تھا ، دوران کتابت میں وہ اس میں اپنے اشعار درج کرتے چلے گئے ، جنھیں سخن نے بعد میں خارج کر دیا اور صرف دو چار شعر رہنے دیے ۔ صفیر نے ''سروش سخن'' کی تین نقلیں تیار کی تھیں ۔ ایک نقل کسی دوسرے صاحب نے تیار کی تھی ۔ ممکن ہے یہی آخری نقل صفیر نے غالب کو بھیجی ہو ۔ خیال ہے کہ غالب کے ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ ہجری کے خط کا جواب جو صفیر نے لکھا ، ''انشائے سبد گل'' میں شامل کرتے وقت اس میں ''سروش سخن'' سے متعلق حصہ تبدیل کر دیا گیا ہے ، جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخن پر یہ واضح کیا جائے کہ صفیر کو ''سروش سخن'' کی تصنیف ہی سے نہیں ، طباعت سے بھی دل چسپی تھی ۔ یعنی اس خط کا آخری پیرا گراف (ملازمت کے وقت . . . . . تا . . . . عنایت فرمائیے) بعد کا اضافہ ہے ۔ اصل خط میں صرف ''سروش سخن'' کے بھیجنے اور اپنی محنت کا ذکر ہوگا جسے حذف کر دیا گیا ۔ اس خیال کو غالب کے جواب سے بھی تقویت پہنچتی ہے ۔ صفیر کے خط کے آخری پیراگراف میں ''سروش سخن'' کی طباعت کے لیے مدد چاہی گئی ہے اور یہی صفیر کا اصل مقصد معلوم ہوتا ہے ، لیکن غالب کے جواب میں اس کا کوئی ذکر نہیں ، بلکہ صفیر کی محنت کی تعریف کی گئی ہے ۔ اگر غالب کے نام اصل خط میں طباعت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے ۔ صفیر کو آرہ و پٹنہ میں طباعت کی سہولتیں میسر تھیں ، اور اس وقت تک ان کی کئی کتابیں چھپ چکی تھیں ۔ ایسی صورت میں ان کا ''سروش سخن'' کی طباعت کے لیے غالب کی مدد چاہنا ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے ۔ مذکورہ خط کے آخری پیراگراف کے سوا باقی خط کو جعلی قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ اس میں غالب کے خط مکتوبہ ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ ہجری کی باتوں کا جواب ہے ۔

قاضی صاحب نے غالب کے خط کے جعلی ہونے کے سلسلے میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ اس میں غالب نے اپنی عمر کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے اس کا زمانۂ تحریر ۱۲۸۲ ہجری ثابت ہوتا ہے ۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، یہ خط ۲۵ ذی قعدہ اور ۷ ذی الحجہ ۱۲۸۱ ہجری کے درمیان کا ہے ۔ ۱۲ رجب ، ۱۲۸۱ ہجری کو غالب اپنی زندگی کے ٦٩ سال پورے کر چکے تھے ، اور اب ان کا یہ کہنا ''یہ سترھواں برس مجھے جاتا ہے'' بالکل درست ہے ۔ ان خطوں کو مشکوک قرار دینے کی سب سے بڑی وجہ صفیر کے خط کا آخری پیراگراف ہے جس میں انھوں نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر کر دیا ہے ۔ ''انشائے سبد گل'' کی طباعت کا آغاز ۱۲۸۹ ہجری میں ہوا ۔ غالب

سے ان کی ملاقات کو سات برس گزر چکے تھے ، اس لیے انھوں نے بے دھیانی میں اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لیے غالب سے ملاقات کے ذکر کا اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سخن اور صفیر کے تعلقات اب پہلے جیسے خوش‌گوار نہیں رہے تھے اور سخن ، صفیر کی شاگردی سے منحرف ہو چکے تھے - صفیر نے سخن کو اپنا شاگرد قرار دینے کے سلسلے میں اپنے ہی خط میں اس پیراگراف کا اضافہ کر دیا -

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صفیر کے خط کے مذکورہ پیراگراف کے سوا صفیر و غالب کے خطوں میں کوئی عبارت ایسی نہیں ہے کہ اسے جعلی قرار دیا جا سکے - مکتوب غالب کے جعلی ہونے کے خیال کو اس امر سے بعد میں تقویت پہنچی کہ اسے جعلی خطوط (نادر خطوط غالب) کے ایک مجموعے میں شامل کیا گیا -

غالب کے خط کا صفیر نے کیا جواب دیا ؟ یہ معلوم نہ ہو سکا لیکن صفیر کی بیاض میں پانچ شعر کی ایک غزل ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے :

بہار آئی ہے اے ابر نوبہار برس
میں بار بار ہوں روتا تو بار بار برس

اس غزل کے آخری دو شعر یہ ہیں :

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غین کی ہے دین (؟)
خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس

یہ واضح ہے کہ یہ قطعہ غالب کے اس شعر کے جواب میں کہا گیا تھا ، جو انھوں نے مذکورہ خط میں اپنی عمر کے سلسلے میں لکھا تھا -

غالب کا جواب آنے کے بعد صفیر نے دو خط لکھے ، جن میں سے پہلے میں مذکورہ قطعہ یا پوری غزل لکھی گئی ہوگی - یہ دونوں خط دستیاب نہیں ہوسکے ، ان کا ذکر غالب نے مندرجہ ذیل خط میں کیا ہے اور یہی غالب کا صفیر کے نام آخری خط ہے - یہ خط پہلے ''مرقع فیض'' (صفحہ ۸۴) میں اور بعد ازاں ''جلوۂ خضر'' (جلد دوم ، صفحات ۲۵ - ۲۲۴) میں چھپا :

مکتوب غالب (۶)

''نور چشم و سرور دل ، فرزانۂ مرتضوی گہر مولوی سید فرزند احمد صاحب زاد مجدہ ! اس نسبتِ عام سے کہ ہم اور آپ مومن ہیں ، سلام

اور اس نسبتِ خاص ہے کہ آپ میرے دوستِ روحانی کے فرزند ہیں دعا اور اس نسبتِ اخص سے کہ آپ میرے خداوند کی اولاد میں سے ہیں بندگی :

میں قائلِ خدا و نبی و امام ہوں
بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

آپ کے دو خطوں کا جواب بسبیلِ ایجاز لکھا جاتا ہے ! دہائی خدا کی مجھے ولایت کی اپیل کی تاب نہیں ، نہ تم اپیلانٹ بنو ، نہ مجھے رسپانڈنٹ بناؤ ۔ لکھ بھیجو کہ ''صبح بہار'' کی عبارت فارسی ہے یا اردو اور ما کتبت فیہ اس کا کیا ہے ؟

نجات کا طالب غالب[1]

چار شنبہ ، ہفتم ذی الحجہ ، ۱۲۸۱ ہجری''

صفیر و غالب کی ملاقات :

غالب کے مذکورہ خط کے بعد صفیر و غالب کی مراسلت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۲۸۲ ہجری کے اوائل میں صفیر دہلی گئے اور وہاں انہوں نے غالب سے ملاقات کی ۔ وہ دہلی میں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے ۔

صفیر نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر کیا ہے ۔ ان بیانات میں سفرِ دہلی کے بارے میں مختلف سنین ملتے ہیں ۔ ''رشحات صفیر'' میں وہ لکھتے ہیں :

'' . . . . میں نے اس رسالے (رشحات صفیر) کو جب درست کیا تو میں ۱۲۸۰ ہجری میں حضرت غالب کی ملازمت کو دہلی گیا اور شاگردی کا شرف حاصل کیا ۔ اس رسالے کا مسودہ میرے ساتھ تھا ، حضرت نے اپنی چشمِ عنایت سے ملاحظہ فرمایا اور اس کی تقریظ لکھ کر عنایت کی جو ''عود ہندی'' میں چھپی ہے ۔'' (صفحہ ۱۴۳)

''جلوہ خضر میں'' (جلد اول ، صفحہ ۲۱۶) میں مفتی صدرالدین آزردہ کے حال میں لکھتے ہیں :

''مولف کتاب [صفیر] ۱۲۸۳ ہجری میں جب حضرت غالب کی ملازمت کے واسطے دہلی گیا تھا ، ان کی خدمت سے فیض یاب ہوا ۔''

جلد اول ہی میں صاحبِ عالم کے ذکر میں (صفحہ ۲۰۰) دہلی جانے کا سنہ ۱۲۸۳ ہجری بتایا ہے ۔ اسی جلد کے صفحہ ۲۲۲ پر انہوں نے یہ سنہ ۱۲۸۲ ہجری

۱۔ ''نجات کا طالب'' کے الفاظ جلوہ خضر میں نہیں ہیں ۔

لکھا ہے اور پھر "جلوۂ خضر" (جلد دوم) میں اپنے حالات لکھتے ہوئے صفحہ ۱۸۸ پر کہا ہے :

"۱۲۸۳ ہجری میں پینتسویں برس فارسی پر توجہ ہوئی ، دہلی جا کر حضرت غالب کی شاگردی کی ۔"

اسی جلد کے صفحہ ۲۱۶ پر یہ بتایا ہے :

"۱۲۸۲ ہجری میں محرم کے آخری مہینے میں حضرت [غالب] کی ملازمت کے لیے دہلی گیا اور ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا"۔

گویا صفیر کے اپنے بیان کے مطابق سفر دہلی ۱۲۸۰ ہجری ، ۱۲۸۲ ہجری اور ۱۲۸۳ ہجری میں ہوا ۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے ۔ اور یہ بھی طے ہے کہ صفیر ایک سے زائد مرتبہ دہلی نہیں گئے ۔ ۱۲۸۱ ہجری کے آخر تک صفیر کا آرہ میں مقیم ہونا ثابت ہے ، کیونکہ غالب کا آخری خط ۷ ذی الحجہ ، ۱۲۸۱ ہجری کا ہے جو صفیر کو آرہ میں ملا ۔ ۱۲۸۳ ہجری میں بھی صفیر آرہ میں تھے اور اس کا ثبوت غالب کا وہ خط ہے جو صاحب عالم مارہروی کے نام ۲۶ اگست ۱۸۶۶ع (۱۵ ربیع الآخر ، ۱۲۸۳ ہجری) کو لکھا گیا تھا اور جس میں صفیر کا ذکر ہے اور یہ صریحاً لکھا ہے کہ وہ پٹنے (آرہ) میں موجود ہیں ۔ صفیر بقول خود محرم کے آخر میں دہلی گئے اور دو ڈھائی مہینے وہاں رہے ۔ اس لیے ۱۵ ربیع الآخر تک دہلی میں ان کا رہنا لازم ہے ۔ غالب کے مذکورہ مکتوب سے پہلے صاحب عالم کو رشحات صفیر کا دیباچہ مل چکا تھا اور وہ اسے صفیر کے پاس بھیج چکے تھے ۔ یہ سب کچھ ۱۵ ربیع الاول سے پہلے ہوا ۔ اگر صفیر ۱۲۸۳ھ کے اوائل میں دہلی میں ہوتے تو دیباچہ صاحب عالم کو کیوں بھیجا جاتا ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صفیر نے ۱۲۸۳ ہجری میں غالب سے ملاقات نہیں کی ۔ اب ۱۲۸۲ ہجری ہی ایسا سال رہ جاتا ہے جس میں صفیر کا سفر دہلی اختیار کرنا یقینی ہے ۔

(باقی)

محمد ایوب قادری

غالب اور مارہرہ

مارہرہ (ضلع ایٹہ ، یو ۔ پی) ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے ۔ اس قصبے میں تین قبیلے خاص طور سے ممتاز اور نامی گرامی تھے (۱) شیوخ کنبوہان کہ عہدۂ قانون گوئی اور منصب چودھر عہد شاہی سے ان ہی میں رہا (۲) شیوخ انصاری ، کہ عہدۂ قضاء ان سے متعلق رہا (۳) سادات واسطیہ ، کہ مشہور پیرزادے ہیں اور ان میں نامی گرامی صوفیہ گزرے ہیں[1] ۔

مرزا غالب کا تعلق مارہرہ کے کنبوہ شیوخ اور سادات سے بہت خاصا رہا ہے اور ان دونوں قبیلوں کے متعدد ارکان غالب کے شاگرد ، دوست اور شناسا تھے ۔ غالب نے اپنے اکثر خطوط میں مارہرہ جانے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے ۔ چنانچہ ایک خط میں چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں[2] :

> ''اگر زمانہ میری خواہش کے مطابق نقش قبول کرتا ہے تو میں مارہرہ کو آتا ہوں ۔ حضرت پیر و مرشد کا اشتیاق اور اس جلسے میں تمھاری دید کا شوق ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو آرام سے بیٹھا رہنے دے گا ۔''

دوسرے خط میں لکھتے ہیں[3] :

> ''جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں ۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں ، طاقت کہاں سے پاؤں ۔''

کنبوہ شیوخ میں سے پہلے شخص جو مارہرہ میں سکونت پزیر ہوئے ، وہ خواجہ عمادالدین عرف شیخ عماد تھے ۔ یہ ہمایوں بادشاہ کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے ۔

۱۔ محمد میاں مارہروی ، اصح التواریخ جلد دوم ، (خانقاہ عالیہ برکاتیہ مارہرہ ۱۳۴۷ھ) ص ۶ - ۷ ۔

۲۔ خطوط غالب جلد دوم (مرتبہ غلام رسول مہر) ص ۲۲۴ ۔

۳۔ ایضاً ، ص ۲۲۹ ۔

ان کی دو صاحبزادیاں ، دو سگے بھائیوں خواجہ محمد امین اور خواجہ محمد حسن ملتانی سے منسوب ہوئیں اور خاندانی تذکروں کے بیان کے مطابق ان دونوں بھائیوں کو ۹۵۴ھ میں مارہرہ کی قانون گوئی اور چودھرات ملی[1]۔ کنبوہوں میں سے پانچ حضرات

(۱) چودھری عبدالغفور سرور ۔
(۲) عنایت الٰہی ۔
(۳) عبدالعزیز ضیاء ۔
(۴) عطا حسین عطاء ۔
(۵) حکیم اشفاق علی ۔

تو غالب کے شاگرد تھے مگر دوسرے حضرات سے بھی غالب کے مراسم تھے جن میں سے چودھری غلام رسول رئیس مارہرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ غالب ان کا بہت احترام کرتے تھے ۔ شاید ہی کوئی ایسا خط ہو جس میں غالب نے ان کو سلام و پیام نہ لکھا ہو ۔

اس جماعت کے دو اور رکن منشی ممتاز علی میرٹھی اور مولوی غلام بسم اللہ بسمل بریلوی (ف۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ع) بھی تھے جن سے خاص تعلقات تھے ، اول الذکر عود ہندی کے مرتب و جامع اور ناشر ہیں اور آخرالذکر غالب کے شاگرد ۔ یہ دونوں آپس میں علاتی بھائی ہیں ۔ ان دونوں حضرات کا تعلق مارہرہ سے بھی تھا مگر مستقل طور سے ان دونوں کی سکونت میرٹھ اور بریلی میں تھی ۔

چودھری عبدالغفور سرور کے خاندان کا مختصر سا شجرہ درج ذیل ہے :

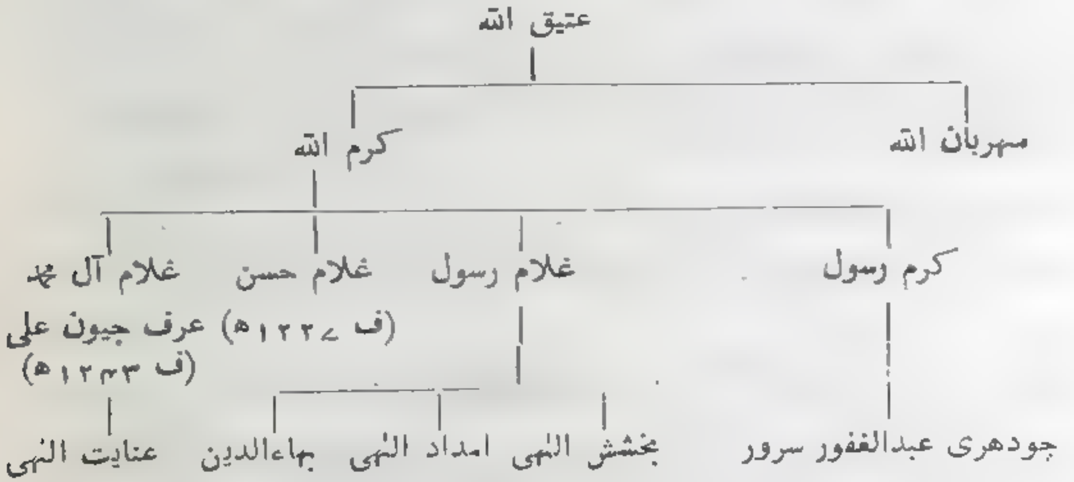

۱۔ سلسلہ عالیہ از حکیم عنایت حسین مارہروی (بہ تصحیح و ترتیب و اضافات از فیض احمد) (مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۳۰۶ھ) ص ۲۱ ۔ و المشاہیر از فیض احمد (نامی پریس میرٹھ ۱۹۰۰ع) ص ۹ ۔

چودھری غلام رسول :

چودھری غلام رسول کا خاندان کمبوہان مارہرہ میں ''بارہ بسے والا'' کہلاتا تھا ۔ ان کے والد شیخ کرم اللہ (ف ۱۲۲۶ھ) کے متعلق اس خاندان کے مورخ حکیم شیخ عنایت حسین مرحوم (ف ۱۲۶۵ھ) لکھتے ہیں[1] :

''کرم اللہ بن عتیق اللہ صاحب دانش و اقبال و در ثقاہت و متانت و حسن قیافہ ممتاز اقران و امثال بود و باستحقاق وراثت عہدہ موروثی چودھر و قانون گوئی بدست آوردہ بہ صدر ریاست قرار ورزید و لوازم عہدہ مذکور بخوبی سر انجام دادہ تا پایان عمر بوقار و اقتدار ہمبریں گزاشت ۔''

چودھری غلام رسول علوم مروجہ سے آراستہ اور ریاست و امارت کے مالک تھے ۔ حکیم عنایت حسین لکھتے ہیں[2] :

''وے با دانش و جاہ خلیق و متواضع است ہموارہ بوقار و اقتدار می‌گزارد ۔''

۱۹ ذی‌الحجہ ۱۲۸۷ھ کو چودھری غلام رسول رہگراے عالم آخرت ہوئے ان کے بھانجے منشی کرم حسن نے مصرع :

فخر دو جہان قبلہ دل کعبہ جان ہائے (۱۲۸۷ھ)

سے تاریخ نکالی ہے[3]۔ چودھری غلام رسول کی اولاد نے امارت کا کارخانہ جلد ہی درہم برہم کر دیا ۔ منشی فیض احمد لکھتے ہیں[4] :

''ورثاے وے مجموعہ ریاست متفقہ چندیں صد سالہ را کہ باعث اعزاز دودمان بود بخش بخش کردہ نام ریاست از صفحہ دہر زدودند و باندک فرصت تلف نمودند ''۔

چودھری غلام رسول کے تین صاحبزادے بہاءالدین ، بخشش الٰہی اور امداد الٰہی (ف ۱۲۹۲ھ) تھے ۔ چودھری بہاءالدین کتاب اخبار الماہرہ کے مولف ہیں ۔ یہ کتاب مطبع صبح صادق سیتاپور سے شائع ہوئی ہے ۔ اس کتاب پر مولف کو انگریزی حکومت کی طرف سے دو سو روپیہ انعام بھی ملا تھا ۔

چودھری عبدالغفور :

چودھری عبدالغفور ، چودھری کرم رسول (ف ۱۲۶۴ھ) کے صاحبزادے

۱۔ سلسلۂ عالیہ ص ۲۶ ۔
۲۔ ایضاً ص ۲۷ ۔
۳۔ ایضاً ص ۲۷ ۔
۴۔ ایضاً ص ۲۷ ۔

اور چودھری غلام رسول کے حقیقی بھتیجے تھے ۔ چودھری کرم رسول کے متعلق حکیم عنایت حسین لکھتے ہیں[1] :

''مرد دانش‌مند با اقبال و در شیوہ مروت و سخا و اخلاق و تواضع و سائر صفات حمیدہ و اوصاف پسندیدہ یگانہ زمانہ و ممتاز اقران و امثال و حالا بر صدر عہدہ پدر قانون گوئی و جودھر رونق افروز است ۔''

چودھری عبدالغفور نے مروجہ تعلیم اپنے چچا چودھری غلام رسول سے حاصل کی اور ان کو چودھری غلام رسول کی پوتی (دختر بہاءالدین) منسوب تھیں ۔ چودھری عبدالغفور کے متعلق منشی فیض احمد لکھتے ہیں[2] :

''عبدالغفور المتخلص بہ سرور شاعر شیوا بیان شیریں زبان رمز فہم ، روشن دماغ ستودہ منش اخلاق روش سیر چشم دیر خشم مہر جو آزرم خوست و بین‌الاخوان بہ حلم و مروت و وقار و اعتبار می گزارد و در فن سخن با نجم الدولہ دبیرالملک اسد اللہ خاں غالب دہلوی کہ غلغلہ جادوبیانیٔ او از ہند تا بہ ایران رسیدہ ، نسبت شاگردی راست حاصل کردہ و بر رقعات اردو غالب دیباچہ نوشتہ کہ آں مجموعہ بقالب طبع آمدہ باسم ''عود ہندی'' مشہور دیار و امصار است ۔''

چودھری عبدالغفور کے کوئی اولاد نہ تھی ۔ انھوں نے اپنے برادر نسبتی (سالے) عزیزالدین کے بیٹے عبدالصبور کو گود لے لیا تھا ۔ عبدالصبور کو بھی شعر و شاعری کا ذوق تھا ۔

چودھری عبدالغفور سرور کا صحیح سال وفات معلوم نہ ہو سکا لیکن بعض قرائن کی روشنی میں ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرے میں فوت ہوئے ۔

برجیس احمد زبیری مارہروی لکھتے ہیں[3] :

''عبدالغفور صاحب میانہ قد کے تھے اور بڑا پاجامہ زیب تن کرتے تھے اور آپ کے یہاں شروع رمضان سے آخر رمضان تک احباب اور اعزہ کا روزہ افطار ہوتا تھا'' ۔

چودھری عبدالغفور سرور نے حکیم امداد حسین مارہروی (ف ۱۲۸۲ھ) کے صاحبزادے علی حسین (ف ۱۲۸۳ھ) کے انتقال پر جو تاریخ کہی ہے وہ بطور

۱- سلسلۂ عالیہ ص ۲۸ -

۲- ایضاً ص ۲۹ -

۳- مکتوب برجیس احمد زبیری بنام راقم موصولہ ۹ دسمبر ۱۹۶۸ع -

نمونہٴ کلام درج ذیل ہے[1]:

وا دریغا وا دریغا وا دریغا وا دریغ
ہائے ہا و ہائے ہا و ہائے ہا و ہائے ہا
دو ہزار و دو صد و ہشتاد و دو ماہ صیام
جانب فردوس شد فخر اطباء رہگرا
پنج پور نامور از وے بگیتی یادگار
صاحبان عقل و علم و دانش و فہم و ذکا
سال نگزشتہ ز فوت والدِ والائے شان
پور چارم را ربود اے وائے از عالم قضا
بود نام او مرکب از علی و از حسین
وہ چہ نام است ایں کہ بر وے باد جان و دل فدا
از وقوع ایں چنین بس سخت و سنگیں واقعہ
رستخیزے گشت پیدا محشرے شد رونما
از یگانہ تا بہ بیگانہ دریں رنج عظیم
ہر یکے را ہست بر لب نعرۂ وا حسرتا
دل بدرد آورد و تاریخ وفاتش نظم کرد
ہر کہ در مارہرہ با شعر و سخن بود آشنا
ہم سرور خستہٴ ناشاد از روے امید
گفت ''حشرش با حسین و با علی روز جزا''

۱۰ + ۱۲۸۲ = ۱۲۸۳ھ

عنایت الٰہی :

عنایت الٰہی ، چودھری غلام رسول کے بھتیجے اور چودھری غلام آل محمد عرف جیون علی (ف ۱۲۴۳ھ) کے صاحبزادے تھے۔ چودھری غلام آل محمد کے متعلق حکیم عنایت حسین لکھتے ہیں[2] :

''مردے با دانش و اخلاق در صفت ہمت و مروت و حلم و وقار یگانہٴ آفاق بود ، بر صدر عہدہ پدر قرار گرفت و حقوق عہدۂ مذکور سر انجام داد ۔''

عنایت الٰہی نے مروجہ تعلیم حاصل کی تھی اور غالب سے مشورہ سخن کیا

۱۔ سلسلہٴ عالیہ ص ۱۷۰ ۔
۲۔ ایضاً ص ۲۶ ۔

تھا ۔ غالب ،چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں[۱] ۔

''عنایت الٰہی کا کون مشتاق نہ ہوگا ۔ اس کی پرسش زائد ، میں خدمت گزاری کو حاضر ہوں ، جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں ، میرا سلام اور پیام کہہ دیجیے گا ۔''

ان کے متعلق منشی فیض احمد مارہروی لکھتے ہیں[۲] :

''سلیم‌الطبع حلیم‌المزاج شیریں زبان لطیف و خنداں سخن سنج معانی شناس ۔ است بر عہدۂ موروثی قانون گوئی ممتاز ماندہ ۔ آکنون از سرکار گردوں وقار انگلشیہ پنشن می یابد و بین الاخوان بالامتیاز می گزارد وچوں حسب قوانین جدیدہ گورنمنٹ انگریزی حق موروثیت حق قانون گوئی زائل و ساقط شدہ و قرار یافتہ ہرکہ از عمر وزید با امتحان قابلیت قانون و استعداد کاردانی کامیاب شود و سند آں از گورنمنٹ بدست آرد ، بریں عہدہ مامور شود و ابنائے وے صغیر و شیر خوار بودند لہذا ہمچو دیگر خانوادہا دریں دودمان گرامی ایں عہدہ برو ختم شدہ ۔''

عنایت الٰہی کا نمونۂ کلام دستیاب نہ ہو سکا ۔ ان کے نامور فرزند مولوی عظمت الٰہی زبیری ہیں جنھوں نے کچھ عرصے وکالت کی اور پھر ایک مدت تک بحیثیت رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ خدمات انجام دے چکے ہیں ۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں ۔ عمر اسّی سے متجاوز ہے ۔

عبدالعزیز ضیاء :

مولوی عبدالعزیز کے والد کا نام غلام کمال تھا ۔ ان کے متعلق منشی فیض احمد لکھتے ہیں[۳] :

''عبدالعزیز پسر دوم غلام کمال ، موزوں طبع ، خوش فکر و در نظم شیریں مقال است و از دختر سخاوت حسین بن شاہد بخش کد خدا شدہ ۔''

مولوی عبدالعزیز کے متعلق مرزا غالب اپنے ایک مکتوب بنام چودھری عبدالغفور میں لکھتے ہیں[۴] :

۱۔ خطوط غالب ، جلد دوم (مرتبہ غلام رسول مہر) ص ۲۱۸ ۔

۲۔ سلسلۂ عالیہ ، صفحہ ۲۷ ۔

۳۔ ایضاً ، صفحہ ۱۷۴ ۔

۴۔ خطوط غالب جلد دوم (مرتبہ غلام رسول مہر) صفحہ ۲۵۱ ۔

"عبدالعزیز صاحب[1] آئے ۔ میں بے کلاہ و بیرہن پلنگ پر لیٹا ہوا تھا ۔ ان کو دیکھ کر اٹھا ، مصافحہ کیا ۔ انھوں نے جناب شاہ عالم صاحب کا خط مع مسودات اشعار دیا اور فرمایا کہ پرسوں جاؤں گا ۔ عرض کیا کہ کل آخر روز آپ تشریف لائیں ۔ خط کا جواب اور اصلاحی مسودے لے جائیں ۔ وہ تشریف لے گئے"۔

مولوی عبدالعزیز کے فرزند برجیس احمد زبیری مارہروی لکھتے ہیں[2] :

"چودھری عبدالغفور کا تخلص سرور تھا اور مولوی عبدالعزیز صاحب کا تخلص ضیاء تھا ۔ یہ دونوں بزرگ حضرت غالب کے شاگرد تھے . . . . مولوی عبدالعزیز درگاہ (خورد) کے وقف کے سربراہ تھے اور آپ اپنے مدرسہ اسلامیہ میں درس و تدریس بلا معاوضہ دیا کرتے تھے اور شہر کے تمام ہندو مسلمان آپ سے فیض‌یاب ہوتے تھے ۔ آپ کے اثر و عزت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی آپ کا گزر بازار سے ہوتا تو تمام ہندو مسلمان تعظیماً کھڑے ہو جاتے ۔"

اس زمانے میں مارہرہ میں چودھری انتظام علی کے یہاں مستقل مشاعرے ہوا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ سرور اور ضیاء میں ایک غزل میں کسی بات پر بحث ہو گئی ۔ وہ غزل مرزا غالب کو بھیجی گئی ۔ اس کا ایک شعر یہ تھا :

نہ بندش بن سکی زلف دوتا کی　　　رسائی دیکھ لی فکر رسا کی

غالب نے اس غزل میں ایک آدھ لفظ بدل کر اصلاح کر دی اور لکھا کہ بھائیوں میں میل جول رہنا چاہیے ۔

ضیاء کا ایک شعر ہے :

نہ تم سا تم سے ہو جائے مقابل　　　ہٹا دو آئنے کو روبرو سے

عبدالعزیز ضیاء کے فرزند برجیس احمد زبیری کا بیان ہے[3] کہ ضیاء کا دیوان اور مرزا غالب کے کچھ خطوط ہندوستان سے پاکستان آنے پر لاہور میں مہاجرت کی حالت میں تلف ہو گئے ۔ عبدالعزیز ضیاء کا انتقال ۱۹۱۲ع میں ہوا ۔ خود برجیس احمد زبیری نوے کے پیٹے میں ہیں ۔

۱- غالب نے سہواً یا مزاحاً ان کے نام سے قبل لفظ "میر" لکھ دیا ہے ۔

۲- مکتوب برجیس احمد زبیری بنام راقم موصولہ ۹ دسمبر ۱۹۶۸ع ۔

۳- ایضاً ۔

شیخ عطا حسین عطا

شیخ عطا حسین ، حکیم نجف علی مارہروی کے صاحب زادے تھے ۔ درس و تدریس مشغلہ تھا ۔ منشی فیض احمد مارہروی لکھتے ہیں[1]:

''نہایت خوش مزاج ، نیک خو ، بذلہ سنج لطیفہ گو تھے ۔ فارسی کی عمدہ استعداد تھی ۔ ہر شخص کے ساتھ خلوص نیاز اور دلسوزی سے ملتے ۔ قلب رقیق تھا عزیز و آشنا کی تکالیف دیکھ کر دل بھر آتا تھا ۔ آبدیدہ ہو جاتے تھے ۔ عمر معلم‌گری میں بسر کی ۔ شعر و سخن کا چسکا رہا ۔ مثنوی (شکایت سعایت) اردو زبان میں ان کی تصنیف سے مشہور ہے ''۔

کچھ لوگوں نے شیخ عطا حسین کو تکالیف پہنچائیں اور ان کا ذہنی سکون چھین لیا اس کے رد عمل میں انھوں نے مثنوی ''شکایت سعایت'' لکھی اور مرزا غالب کی خدمت میں بھیجی انھوں نے کہیں کہیں اصلاح بھی کی ۔ مرزا غالب اپنے ایک مکتوب بنام چودھری عبدالغفور میں لکھتے ہیں[2]:

''صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہو گئی ہے ۔ ہے ہے اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے ، تب یہ تراوش خونابہ ظہور میں آئی ہوگی ۔ مزہ یہ ہے کہ عنوان بیان سے حق بجانب انھیں کے معلوم ہوتا ہے ۔''

۷ ذی‌الحجہ ۱۲۹۶ھ کو شیخ عطا حسین کا انتقال ہوا ۔

مثنوی ''شکایت سعایت'' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں[3]:

دل شکستہ ہوں اور غم زدہ ہوں — خستہ تن اور میں ستم زدہ ہوں
دردمند اور جگر گداختہ ہوں — ایک غم سے میں زہرہ باختہ ہوں
تاب و طاقت رہین وحشت ہے — خواب و آرام وقف حسرت ہے
نہ چمن ہوں نہ باغبان چمن — مرغ گم گشتہ ، آشیان چمن
کیا کہوں کیسا بے نصیب ہوں میں — ہوں وطن میں ولے غریب ہوں میں
ماجرا اپنا گر سناؤں کبھو — چشم خورشید سے گریں آنسو
ابر کا سینہ چاک ہو جاوے — برق بھی جل کے خاک ہو جاوے

۱۔ فیض احمد مارہروی ، المشاہیر ، (نامی پریس میرٹھ ۱۹۰۰ع) صفحہ ۲۳۶۔ نیز ملاحظہ ہو سلسلہ عالیہ ۴۳ ، ۴۴ ۔
۲۔ اردوے معلیٰ (اکمل المطابع دہلی ۱۸۹۱ھ) صفحہ ۱۱۱ ۔
۳۔ فیض احمد مارہروی ، المشاہیر صفحہ ۲۳۷ ، ۲۳۸ ۔

دیکھ کر حال چرخ دوں پرور کی معلم گری میں عمر بسر
گرچہ کچھ اس قدر نہ تھی پروا مقتضائے زمانہ پر یوں تھا
ایک مدت برنگ فصل بہار رہی مکتب کی گرمیِ بازار
پھر کچھ اس میں کساد آنے لگا آخر آخر فساد آنے لگا

حکیم اشفاق علی زکی :

حکیم اشفاق علی ابن شیخ الطاف حسین مارہروی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ درسی تعلیم کے علاوہ علم طب کی بھی تحصیل کی۔ محکمہ بندوبست میں ملازم رہے۔ کچھ دنوں گوالیار میں رہے۔ ۱۹۰۷ء میں بھوپال پہنچے۔ ملازمت کی اور وہیں ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوا، طویل عمر پائی۔ شعر و سخن کا ذوق تھا اور غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ شاہ ابوالحسین نوری میاں مارہروی سے بیعت تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے[1] :

دم الجھنے لگا ہے بے الجھے زلف الجھی اگر تو کیا ہوگا
رہگزار بلا پہ بیٹھے ہیں نہ ملا راہبر تو کیا ہوگا

صیادِ دور، موسم گل، سامنے چمن
کنج قفس میں روؤں نہ کیوں بال و پر کو میں
زار انتظار خط نے کیا اس قدر مجھے
انجان سوچتا ہوں مگر نامہ بر کو میں
قدر سخن زمانے میں باقی نہیں زکی
کس کو دکھاؤں آج متاع ہنر کو میں

سفلوں سے پوچھتا ہوں غربت میں کہیے کیسا مزاج عالی ہے؟

اب مارہرہ کے خاندان سادات واسطی کے جن لوگوں سے غالب کے تعلقات تھے ان کے مختلف حالات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ مالک رام، تلامذۂ غالب (نکودر، ۱۹۵۷ء) صفحہ ۳۰۳-۳۰۵۔

صاحب عالم :

عہد اکبری کے نامور صوفی شیخ میر عبدالواحد بلگرامی صاحب سبع سنابل (ف ۱۰۱۷ھ) کے فرزند میر عبدالجلیل (ف ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ع) تھے جو جذب و کیف کی حالت میں وارد مارہرہ ہوئے اور اس زمانے کے کمبوہ شیوخ کے نامور اور ممتاز رکن چودھری صدرالدین اور ان کے صاحبزادے چودھری وزیر محمد خاں ان کے مرید ہوئے - ان لوگوں نے میر صاحب کے لیے حویلیاں وغیرہ بنوا دیں[۱] - ان میں میر عبدالجلیل کے پوتے شاہ برکت اللہ عشقی (ف ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ع) ابن میر اویس تھے جو بلگرام کی سکونت ترک کر کے مستقل طور سے مارہرہ میں سکونت پذیر ہو گئے - شاہ برکت اللہ صاحب حال صوفی عارف کامل اور ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ تھے - فارسی میں عشقی اور بھاکا میں پیمی تخلص کرتے تھے - ان کا فارسی اور بھاکا کا کلام شائع ہو چکا ہے[۲] -

شاہ برکت اللہ کے دو صاحبزادے آل محمد (ف ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۶ع اور نجات اللہ (ف ۱۱۹۰ھ/۶-۱۷ع) تھے - ان دونوں بھائیوں نے مارہرہ میں الگ الگ دو خانقاہیں قائم کیں - بڑے بھائی کی خانقاہ ''سرکار کلاں'' اور چھوٹے بھائی کی خانقاہ ''سرکار خورد'' کہلائی - صاحب عالم شاہ نجات اللہ (سرکار خورد) کے پوتے تھے صاحب عالم کے سلسلے کا شجرہ درج ذیل ہے[۳] کیونکہ اس سلسلے کے مختلف حضرات کا ذکر آگے آ رہا ہے -

---

۱- محمد میاں مارہروی ، خاندان برکات (حسنی پریس بریلی ۱۹۲۷ع) ص ۵ -

۲- ایضاً ص ۷-۱۲

۳- ہم نے یہ شجرہ سادات مارہرہ سے متعلق مختلف کتب کاشف الاستار (قلمی مملوکہ خود) آثار احمدی (قلمی مملوکہ خود) اصح التواریخ از محمد میاں (مطبوعہ) خاندان برکات از محمد میاں (مطبوعہ) نور مدائح حضور از غلام شبر بدایونی (مطبوعہ) برکات مارہرہ از طفیل احمد بدایونی (مطبوعہ) کی روشنی میں مرتب کیا ہے -

- شاہ نجات اللہ
  - شاہ مقبول عالم عرف سوندھا (ف ۱۲۱۲ھ)
    - سید مخدوم عالم
      - سلطان عالم عرف شہزادے (ف ۱۲۰۳ھ)
        - سید عالم (ف ۱۳۰۲ھ)
          - نور عالم
        - شاہ عالم (ف ۱۳۰۸)
          - خورشید عالم (ف ۱۳۰۸ھ)
            - جان عالم
              - بدر عالم
              - مقصود عالم
              - شاہ عالم
              - اقبال عالم
        - مقبول عالم (ف ۱۰۳۳ھ)
          - مخدوم عالم عرف بدلے میاں (ف ۱۳۳۷ھ)
          - افتخار عالم عرف سدلے میاں (ف ۱۳۴۳ھ) مؤلف حیات النذیر
        - دختر منسوب بہ سید عبدالحی عرف سید احمد
          - فرزند احمد صفیر بلگرامی
      - صاحب عالم
  - سید امام عرف شاہ گدا (ف ۱۲۰۵ھ)
    - نجات بخش فقیر (ف ۱۲۳۹ھ)
      - دختر منسوب بہ صاحب عالم
      - سید محمد امیر عرف امیر (ف ۱۲۹۰ھ)
        - امیر زادی منسوب بہ شاہ عالم
        - شاہ محمد حسن (ف ۱۳۰۴ھ)
          - شاہ مجتبیٰ حسن (ف ۱۳۱۱ھ)
            - علی احسن مارہروی (ف ۳۰ اگست ۱۹۴۳ع) مشہور شاعر و ادیب
        - شاہ برکات حسن (ف ۱۳۲۴ھ)
    - برکات بخش بھکاری (ف ۱۲۵۳ھ)

صاحب عالم سے مرزا غالب کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے ۔ وہ اپنے ہر خط میں محبت، خلوص ، نیازمندی اور ارادت کا اظہارکرتے تھے ۔ یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ صاحب عالم سے غالب کے یہ تعلقات کب اور کس طرح قائم ہوئے مگر ان ہی تعلقات کی بنا پر صاحب عالم کے احباب ، بیٹے اور نواسے غالب کے حلقۂ تلمذ میں منسلک ہوئے ۔ غالب اپنے ہر خط میں صاحب عالم کا ذکر نہایت محبت و ارادت سے کرتے ہیں ۔ چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں[1] :

''آرزوے دید حد سے گزر گئی ۔ یا رب جب تک صاحب عالم کو مارہرہ میں اور انوارالدولہ کو کالپی میں نہ دیکھ لوں اور ان سے ہم کلام نہ ہو لوں ، میری روح کو قبض کا حکم نہ ہو ۔ لیکن ۱۲۷۷ھ میں دو مہینے باقی ہیں ۔ اب کے محرم سے اس ذی الحجہ تک میرا مدعا حاصل ہو جائے ۔''

مرزا غالب ایک خط میں چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں[2] :

''میں یہ تاکے ہوئے ہوں کہ میری اور تمھاری ملاقات اس طرح ہو کہ ہم تم ہوں اور حضرت صاحب عالم صاحب ہوں اور باہم حرف و حکایت کریں ۔ اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا تو میں مارہرہ کو آتا ہوں ۔''

صاحب عالم کے نام مرزا غالب کے صرف پانچ ہی خط ہیں جو ''خطوط غالب'' میں شامل ہیں[3] ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ چودھری عبدالغفور مارہروی کے نام جتنے خط ہیں وہ بالعموم چودھری صاحب اور صاحب عالم کے نام مشترک ہیں ۔ صاحب عالم کا خط خراب تھا ۔ غالب ایک ہی خط میں دونوں کو مشترک لکھ دیتے تھے اور غالباً اسی طرح جواب جاتا ہوگا ۔

صاحب عالم ابن مخدوم عالم ۱۶ ربیع الثانی[4] ۱۲۱۱ھ کو پیدا ہوئے[5] ۔

۱۔ اردوئے معلیٰ ص ۱۶۸ :
۲۔ خطوط غالب جلد دوم (مرتبہ غلام رسول مہر) ص ۲۲۴
۳۔ ایضاً
۴۔ محمد میاں (خاندان برکات ص ۴۷) نے ۲۶ ربیع الثانی لکھا ہے ۔
۵۔ ایک مرتبہ صاحب عالم نے غالب کو لکھا کہ میرا سال پیدائش لفظ ''تاریخ'' سے نکلتا ہے تو غالب نے لکھ بھیجا :

ہاتف غیب شب کو یوں چیخا ان کی ''تاریخ'' میرا ''تاریخا''

تاریخ سے ۱۲۱۱ھ اور تاریخا سے ۱۲۱۲ھ نکلتے ہیں ۔

تعلیم مارہرہ ، فرخ آباد اور لکھنؤ میں پائی ۔ کچھ دنوں صاحب عالم اور ان کے بھائی سلطان عالم فرخ آباد میں رہے ۔ صاحب دیوان شاعر تھے ۔ تذکرہ خازن الشعراء کے مولف سید محمد میرن جان مہدی الہ آبادی ۱۲۹۰ھ میں صاحب عالم کا تذکرہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں[1] :

''شاعر سراپا کمال عدیم المثال مولوی سید صاحب عالم حسینی واسطی بلگرامی ثم المارہروی سلمہ اللہ تعالیٰ است ۔ ولادتش روز سہ شنبہ وقت ضحیٰ شانزدہم ربیع الثانی سال ہزار و دو صد و یازدہ ہجریہ کہ لفظ تاریخ از'ن خبر می دہد در دار الکرام بلگرام بلگرام بودہ ۔ میر عبدالواحد بلگرامی مصنف کتاب سبع سنابل و شارح نزہت الارواح از اجداد پدری اوست ۔

مولوی جمیع کتب درسیہ درمعمورۂ لکھنؤ بخدمت مولوی ولی اللہ خان گزرانیدہ و در فن شعر از خال خود سید افتخار علی بلگرامی متخاص بہ ذرہ تلمذ دارد و چوں اتحاد سلسلہ بیعت و اجازت حضرت شیخ محمد افضل الہ آبادی و سید برکت اللہ عرف شاہ ابوالبرکات عشقی تخلص (جد الاجداد مولوی) بخاندان حضرات کالپی فی مابین برزگان ایں فقیر و برزگان آں عزیز محبت و وداد بود ۔ بعد معاودت از قصبہ کواتھ مع قبائل بسابقہ معرفت در الہ آباد تشریف آوردہ رونق افروز دائرہ متبرکہ جدم حضرت شیخ محمد اجمل قدس سرہ شد ۔ درمیان والد ماجد ایں مستہام و ابں فقیر بدنام بآں صاحب عز و احترام سلسلۂ مودت و محبت استحکام دیگر بذیرفتہ و در مارہرہ بر سجادۂ آبائے کرام خود گم گشتگان وادی حرمان را رہنموئی کند ۔ وے مرید و مجاز و ماذون از خدمت میر سید ابو سعید عرف شاہ خیرات علی صاحب سجادہ حضرت قطب الاقطاب میر سید محمد ساکن کالپی است در مدح پیر روشن ضمیر خود ایں رباعی گفتہ :

فیضے ز عنایات علی یافتہ ام رشدے ز کرامات علی یافتہ ام
علم و عمل و دولت اولاد و شرف ایں جملہ ز خیرات علی یافتہ ام

۱۔ تذکرۂ خازن الشعراء کا یہ اقتباس مولانا حسرت موہانی نے اردوے معلیٰ میں نقل کیا تھا ، وہیں سے ہم نے لیا ہے ۔ افسوس اردوے معلیٰ کا ماہ و سال اشاعت لکھنے سے رہ گیا ۔

مولوی صاحب دیوان است و در دیوان او از ہر قسم غزل ، رباعی ، فرد
قطعات و مخمسات موجود است ۔

نمونۂ کلام :

آں حور کہ از آئنہ مستور نشیند　　بے پردہ کجا بامن مہجور نشیند

عمر من شد بجدائی آخر　　جان من آہ کجائی آخر

صاحب عالم نے فن تاریخ گوئی پر ایک کتاب ''تحفۃ المورخین'' فارسی زبان میں لکھی ہے جس کا قلمی نسخہ ''جواہر میوزیم'' اٹاوہ میں محفوظ ہے ، اس کتاب میں ۵۲ اوراق ہیں اور تقطیع $7\frac{1}{2} \times 5$ ہے ، یہ کتاب ایک مقدمہ ، دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے اور ۱۲۵۸ھ کی مکتوبہ ہے[1] ۔

صاحب عالم کا انتقال ۲ محرم ۱۲۸۸ھ کو مارہرہ میں ہوا ۔ مولوی محمد میاں مارہروی لکھتے ہیں[2] :

''گنبد درگاہ معلیٰ (مارہرہ) میں جانب غرب دفن ہوئے ۔ آپ کا عقد دختر حضرت فقیر صاحب ابن حضرت شاہ گدا صاحب سے ہوا ۔''

صاحب عالم نے تین صاحب زادے سید عالم ، شاہ عالم ، مقبول عالم اور تین لڑکیاں یادگار چھوڑیں ۔ بڑی لڑکی عبدالحی عرف سید احمد بلگرامی سے منسوب تھیں جن کے صاحب زادے فرزند احمد صفیر بلگرامی تھے ۔ صاحب عالم نے حکیم امداد حسین مارہروی (ف ۱۲۸۲ھ) کے انتقال پر ایک مرثیہ لکھا ہے ۔ اس کے کچھ اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں[3] :

دریغا ز نیرنگیِ آسماں　　دریغا ز بیداد دور زماں
دریغا ز تقلیب لیل و نہار　　دریغا ازیں انقلاب جہاں
دریغا کہ جمعیت ما گسیخت　　دریغا یکے رفتہ از ہم سناں
دریغا ز گلہاے احباب ما　　گلے ریخت بر خاک باد خزاں

۱۔ ابرار حسین فاروقی ، جواہر زواہر ۔ (اٹاوہ، ۱۹۵۹ع) ص ۲۳۲-۲۳۴ ۔
۲۔ خاندان برکات ص ۴۷ ۔
۳۔ سلسلۂ عالیہ ص ۱۵۳-۱۵۵ ۔

دریغا یکے از محبان خاص نہاں گشتہ از چشم ما ناگہاں
دریغا حکیمے مسیحا نفس بحکم قضاء و قدر داد جاں
مرکب کن امداد را با حسین سپس نام نامی او را بخواں
دریغا گزشت آنکہ بودے ببزم نواسنج چوں بلبل بوستاں
دریغا نماند آنکہ درشہر بود بگفتار طوطی شیریں زباں
دریغا کہ رفت آنکہ در دہر بود بہ ہرسو ز اوصاف او داستاں

ہمہ را بلب نالہ از درد و غم ز چشم ہمہ قلزم خوں رواں
خیالش جدا نہ ز دلہاے شاں یکے لمحہ یک لحظہ یک دم یک آں
کند شرح غم ہاے آنہا رقم قلم را چہ یارا چہ تاب و تواں
دریغا ملال دلم صاحبا ز فوت چنیں زبدۂ دوستاں
کہ مثلش نیارد فلک در وجود انیس بصدق و صفا تو اماں
فغانم نہ خیزد ز سینہ چرا سرشکم نہ ریزد ز دیدہ چساں
دریغا کہ رفت از کف روزگار چنیں گوہرے بے بہا رائگاں
کنوں تاکہ باقی ست ما را حیات بود یاد او مونس ما بجاں
ز یاران مارہرہ و بلگرام رواں شد بسوئے عدم کارواں
فراہم کند ما ہمہ را بخلد رب مستغاث و حق مستعاں
قلم سال ایں یار مارہروی رقم زد عجب یار خلد آشیاں
ز رضوان شنیدیم تاریخ او گل نو بیامد بباغ جناں

مرزا غالب نے اپنے خطوط میں صاحب عالم کے تینوں بیٹوں سید عالم ، شاہ عالم اور مقبول عالم اور ان کے پوتے خورشید عالم ، ان کے برادر نسبتی (سالے) سید محمد امیر اور محمد امیر کے فرزند برکت حسن کا ذکر اپنے خطوط میں بار بار کیا ہے لہٰذا ان حضرات کے مختصر سے حالات بھی درج ذیل ہیں :

سید عالم :

صاحب عالم مارہروی کے فرزند اکبر تھے - ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲ محرم ۱۳۰۲ھ کو فوت ہوئے[1] - اپنے والد کے سجادہ نشیں تھے ان کے دو بیٹے خورشید عالم اور نور عالم تھے - خورشید عالم کا ذکر غالب نے اپنے خط میں کیا ہے - خورشید عالم کی پیدائش ۲ جمادی الاول ۱۲۵۵ھ کو ہوئی اور

۱- خاندان برکات ص ۷۵ -

انتقال ۱۸ جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ کو ہوا[1] ۔ ان کے ایک بیٹے سید جان عالم تھے[2] جن کے بیٹے سید بدر عالم ، انجمن ترقی اُردو کراچی میں ملازم ہیں اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے خادم خاص رہ چکے ہیں ۔

شاہ عالم :

صاحب عالم کے دوسرے صاحب زادے تھے ۔ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱۱ محرم ۱۳۰۳ھ کو ہوا اور دالان غربی گنبد درگاہ میں دفن ہوئے[3] ۔ ان کا عقد ان کے ماموں سید محمد اسیر کی صاحب زادی کے ساتھ ہوا تھا ۔ غالب کے شاگرد تھے ، شائق تخلص تھا ۔ ان کے نام غالب کے دو خط ہیں انھوں نے صفیر بلگرامی کے لڑکے کی پیدائش پر جو قطعہ تاریخ کہا تھا وہ بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہے[4] :

چوں نشوم شاد کہ ناگہ ز شرق — مژدہ رساں پیک صبا آمدہ
گفت کہ در خانہ شمس الضحیٰ — رشک سہا ، بدر الدجی آمدہ
ہاں بوجود آمدہ پور صفیر — کو ہمہ تن ذہن و ذکا آمدہ
شائق شاداں پے تاریخ طفل — گفت ''زہے شمس ضحیٰ آمدہ''
۱۲۸۳ھ

مقبول عالم :

صاحب عالم کے تیسرے بیٹے تھے ۔ ان کی پیدائش ۶ جمادی الاول ۱۲۴۵ھ اور ان کا انتقال ۱۰ محرم ۱۳۰۳ھ کو ہوا ۔ دالان غربی گنبد درگاہ میں دفن ہوئے[5] ۔ ان کا پہلا عقد دختر سید مظہر حسن کے ساتھ ہوا جس کا ذکر غالب نے اپنے خط میں کیا ہے اور صاحب عالم کو مبارک باد دی ہے ۔ ان سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جن میں سے ایک خورشید عالم کو منسوب تھیں ۔ مقبول عالم کی دوسری بیوی اظہر فاطمہ دختر سید ابوالقاسم تھیں جن سے دو صاحب زادے مخدوم عالم اور افتخار عالم ہوئے ۔ آخر الذکر حیات النذیر کے مؤلف ہیں ۔

۱۔ خاندان برکات ص ۷۵-۷۶ ۔
۲۔ ایضاً ص ۷۶ ۔
۳۔ ایضاً ص ۷۷ ۔
۴۔ تلامذۂ غالب ص ۱۶۷ ۔
۵۔ خاندان برکات ص ۷۷ ۔

محمد امیر :

سید محمد امیر ابن نجات بخش پھکاری ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۴ ربیع الآخر ۱۲۹۰ھ کو انتقال ہوا ۔ دالان بائیں گنبد درگاہ میں دفن ہوئے ۔ اپنے چچا برکات بخش پھکاری کے انتقال (۱۸ رجب ۱۲۵۳ھ) کے بعد سجادہ نشیں ہوئے[1] ۔ وہ صاحب عالم کے برادر نسبتی (سالے) اور شاہ عالم کے خسر تھے ۔ محمد امیر کے متعلق غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

''جناب مستطاب حضرت محمد امیر صاحب کی خدمت میں بعد سلام نیاز یہ گزارش ہے کہ میرے پاس حضرت کا سلام و پیام اب کی بار بھی نہیں پہنچا ۔''

غالب نے اپنے متعدد خطوط میں سید محمد امیر کو سلام لکھا ہے اور شاہ عالم کے دونوں خطوں میں لکھا ہے کہ اپنے ماموں کو سلام کہیے ۔

برکات حسن :

سید محمد امیر کے صاحب زادے برکات حسن تھے جن کا ذکر غالب نے اپنے اس خط میں کیا ہے جو انھوں نے صاحب عالم کو لکھا ہے ۔ برکات حسن دہلی میں غالب سے ملے بھی تھے اور یہ غالب کا آخری زمانہ تھا ۔ جب برکات حسن نے مزاج پرسی کی تو غالب نے اپنے شعر کو بدل کر یوں پڑھ دیا :

ضعف نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

برکات حسن کی پیدائش ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۵۱ھ کو ہوئی اور ان کا انتقال ۱۷ جمادی الآخر ۱۳۲۴ھ کو ہوا[2] ۔

صفیر بلگرامی :

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ، جلوۂ خضر کے مؤلف اور غالب کے مشہور شاگرد ہیں ۔ وہ صاحب عالم کے نواسے ہیں اور مارہرہ میں پیدا ہوئے ۔ انھوں نے مارہرہ ہی سے غالب کو تلمذ کے لیے درخواست مع کلام بھیجی جس پر ان کے نانا صاحبِ عالم نے سفارش بخط چودھری عبدالغفور مارہروی لکھی ۔ غالب نے اس پر اصلاح دے کر مارہرہ بھیجا ۔ صفیر خود لکھتے ہیں[3] :

۱- خاندان برکات ، ص ۷۱ ۔
۲- ایضاً ص ۷۳ ۔
۳- صفیر احمد بلگرامی ، جلوۂ خضر جلد دوم (آرہ ، ۱۸۸۵ع) ص ۱۸۸ ۔

"صفیر بیچمداں مؤلف تذکرہ (جلوۂ خضر) سید فرزند احمد بلگرامی آری مقاسی ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۴۰ھ کو بمقام مارہرہ ضلع ایٹہ متصل علی گڑھ کول اپنے ننہال میں پیدا ہوا ۔ تین برس کی عمر میں بلگرام ضلع ہردوئی صوبہ اودھ اپنے وطن میں آیا اور پانچویں برس بمقام آرہ ضلع شاہ آباد میں اپنے جد و والد کے ساتھ آ کر رہا ۔ چودھویں برس شاعری کا شوق ہوا ۔ پندرھویں برس سید محمد سہدی بلگرامی اپنے پھوپھا کا شاگرد ہوا . . . ۱۲۸۳ھ میں پینتیسویں برس فارسی پر توجہ ہوئی ۔ دہلی جا کر حضرت غالب کی شاگردی اختیار کی" ۔

صفیر مارہرہ سے دہلی پہنچے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

رسیدم از مدد بخت تا بمارہرہ — بدل ارادۂ دہلی ضرور تر کردم
ولے رسیدن دہلی بود توقف . . . — ز حال خویش جناب ترا خبر کردم
ز جد مادریم رفتہ پیش ازیں رقمے — من ایں مراسلہ ارسال پر اثر کردم

صفیر کی کتاب "فیض صفیر" (رسالہ تذکیر و تانیث) پر غالب نے جو دیباجہ لکھا وہ ان کے نانا کے پاس مارہرہ ہی آیا تھا ۔ صفیر بلگرامی کا انتقال ۲۲ رمضان ۱۳۰۷ھ کو بمقام عظیم آباد ہوا اور آرہ میں دفن ہوئے ۔

غالب کے خطوط میں مارہرہ کے چند اور حضرات میر امداد علی شاہ ، فیض علی خاں ، فضل احمد اور بخش الدین کے نام بھی آتے ہیں مگر سردست ان حضرات کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہ ہو سکیں ۔

پڑھے لکھے لوگوں کا پڑھا لکھا رسالہ

ماہنامہ

"کتاب"

۱۔ منٹگمری روڈ ، لاہور

جو اپنے ہر شمارے میں کم از کم بیس مختلف علوم و فنون پر بیس مفید اور معلوماتی مضامین شائع کرتا ہے ۔

۸۴ باتصویر صفحات ۔ ہر مرتبہ نیا رنگین دیدہ زیب سرورق ۔ اس کے باوجود قیمت صرف پچاس پیسے ۔

اسرارالحق

غالب کا ایک خط اور ناظم سے منسوب غزل

جناب ایڈیٹر صاحب سلام علیکم

پچھلی برسات میں والدی انوارالحق صاحب مرحوم و مغفور کی کتابوں اور رسالوں کو نمی سے بچانے کے لیے دھوپ دکھا رہا تھا۔ ان میں ایک شکستہ رسالہ بھی تھا جس کے شروع کے بارہ صفحے کبھی ضائع ہو گئے ہیں اور آخر کے کچھ وراق کو دیمک نے بھی کھا لیا ہے۔ آخری صفحے کا نمبر ۴۸ ہے لیکن اس سے آگے بھی ورق ہوں گے اس لیے کہ صفحہ ۴۵ سے ایک انشائیہ شام غریباں شروع ہوا ہے اور صفحہ ۴۸ تک ختم نہیں ہوا۔ رسالے کا سائز عام کتابوں کے سائز [کے مطابق ہے] صفحہ ۱۳ سے یہ عبارت شروع ہوتی ہے: (''کا کتاب خانہ سلف کے نوادر کا ذخیرہ ہے ہماری درخواست پر مثل سابق نواب صاحب ممدوح نے یہ نادر و نایاب خط جو غالب صاحب مرحوم مرزا نوشہ کی طرز تحریر کا خوبصورت نمونہ ہے اور آنکھوں سے لگانے کے لائق ہے، اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا اور آئندہ بھی سرپرستی کا وعدہ فرمایا۔ اڈیٹر'') اس کے بعد مکتوب مرزا غالب صاحب مرحوم مرزا نوشہ لکھ کر وہ خط درج کیا ہے جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں نے غالب کے خطوں کے چار مجموعے دیکھے۔ ان میں یہ نہیں ہے۔ یعنی اردوے معلی، عود ہندی، خطوط غالب مرتبہ مالک رام اور غالب کی نادر تحریریں۔ آپ بھی احتیاط کے طور پر اسے اور دیکھ لیں اور دکھالیں۔ غالب کے خط میں جو غزلیں ہیں ان میں کی آخری غزل رسالے میں اس طرح نامکمل ہے جس طرح میں نے نقل کر دی ہے۔ رسالے کے ہر صفحے پر ستمبر ۱۹۰۳ع درج ہے مگر نام کہیں نہیں ہے اس لیے [نام درج کرنے سے] معذور ہوں۔

جس نمبر میں آپ اسے چھاپیں ایک کاپی مجھے بھی ضرور بھیج دیجیے گا۔

نیاز مند

اسرارالحق

مکتوب مرزا غالب صاحب مرزا نوشہ

جناب عالی نامہٗ وداد پیام عز صدور لایا ۔ حضرت کو اب تو یقین آیا کہ بغیر توسط کے بھی ڈاک کے ہرکارے گمنام کا نام جانتے ہیں ۔ اس بقعہٗ معمور سراسر سرور میں غالب مغموم بہت مسرور ہے ۔ اورکیوں نہ ہو ، فقیر کی قدر و منزلت کیا اہالی شہر اور کیا والی شہر ہر دو جانب سے ارزش سے بڑھ کر ہے ۔ ارمغان کی فرمایش سر آنکھوں پر مگر یہاں کا ارمغان اہل شہر کی کشش سیرت و صورت اور روش خلوص و مروت ہے یا نواب عالی جناب معلیٰ القاب کا دیدار پر انوار اور گل افشانی گفتار ہے ۔ شہر کا حال یہ کہ ذوق شعر گوئی و شعر فہمی کا جو پایہ میں نے یہاں پایا جمیع اہل ہند کو بھی میسر نہ آیا ۔ رام پور کہاں ہے ، اس باب میں روکش شیراز و اصفہان ہے ، ہر شخص شعر کا فریفتہ ، شعر ہر شخص پر فریفتہ ۔ شہریار کا حال یہ کہ سچ عرض کرتا ہوں نواب صاحب کو پروردگار نے جیسا حسن و تناسب اعضاء و اندام دیا ہے ، ویسا ہی حسن تخیل و اعجاز کلام دیا ہے ۔ چند روز ہوئے بیاض مردف کے اوراق برائے اصلاح مرحمت فرمائے لیکن اس سحر حلال کو کوئی کیا بات لگائے ۔ خدا کی قسم مجھے اس شخص کے حسن صورت پر رشک آتا اگر اپنے تئیں اس کا ہم عصر پاتا ۔ بھلا شیریں کلامی پر نکیوں رشک آئے ۔ دعا گو کہتا ہے کہ خدا اسے نظر بد سے بچائے ۔ میں نے تو حضور سے صاف صاف عرض کر دیا کہ ان اشعار کے پردے میں ولی نعمت نے معانی کی پریوں کو بند کیا ہے ۔ فقیر نے حسب ارشاد خداوند نقطہ ہائے اصلاحی کو ان کی دفع نظر بد کے لیے دانہ ہائے سپند کیا ہے ۔ سن کے گلے سے لگا لیا اور فرمانے لگے کہ مرزا صاحب آپ کے نقوش قدم پر قدم رکھنے کی بے ادبی ہوئی ہے تو معاف فرمائیے مگر اس میں ہماری عقیدت کو دخل ہے ۔ اس جسارت پر ہنسی نہ اوڑائیے ۔ عرض ہؤا حقا کہ میرے معروضات میں مبالغہ کا شائبہ بھی نہیں اور سنو تعجب کروگے کہ فرزند دلبند بھی نواب صاحب کو اخلاق پسندیدہ و اوصاف حمیدہ کا مالک ملا ہے ۔ خوش گفتار صاحب کردار ، غرض کئی دن سے یہی اوراق غزلیات پڑھ رہا ہوں ۔ کہیں کہیں غلطی املا ہے اور بس ۔ اغلاط کو بناتا اور کاتب ناہنجار کر بزبان قلم بتاتا چلتا ہوں ۔ واسطے تمہارے دو غزلیں ارمغان بھیجتا ہوں ۔ انصاف سے کام لو ، کہاں قلم لگاؤں ضد کی اور بات ، کیا یہی کہے جاؤ گے تو نے خواہ نخواہ نواب مصطفے خاں سے بڑھا دیا والسلام مع الاکرام جواب کا طالب غالب ۔ نگاشتہ صبح پنجشنبہ نہم فروری سال حال ۱۲ ۔

غزلیات

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیر آہ و زاری شبہاے تار جھوٹ
آوازۂ قبول دعاے سحر غلط

سوز جگر سے ہونٹھ پہ تبخالہ افترا
شور فغاں سے جنبش دیوار و در غلط

ہاں سینے سے نمایش داغ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے تراوش خون جگر غلط

بوس و کنار کے لیے یہ سب فریب ہیں
اظہار پاکبازی و ذوق نظر غلط

لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں
عاقل نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جان عزیز پیشکش نامہ بر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہو جان دی ہے سر رہ گزر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اوڑائی خبر غلط

آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیے
ہے نظم و نثر اہل سخن سر بسر غلط

یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط

دیگر

مٹی نہ وصل میں بھی کلفت زمان فراق
تمام رات کہی ہم نے داستان فراق

جہاں میں کیا نہیں ہوتی خزاں کے بعد بہار
بہار وصل نکیوں ہو پس از خزان فراق

خوشا حبیب و ادا ہاے دلستان حبیب
بدا فراق و المہاے جانستان فراق

ڈاکٹر خلیق انجم

غالب کے دو جعلی شاگرد اور ایک جعلی تحریر

تاریخ ادب اردو میں بہت سے ایسے جعل ملتے ہیں جو اپنے موجد کی ذہانت کا دلچسپ ثبوت ہیں ۔ غالب کی شہرت اور مقبولیت نے بھی کئی ادبی جعل سازیوں کو جنم دیا ہے ۔ مثلاً مولانا عبدالباری آسی نے خود بائیس غزلیں کہہ کر شرح کلام غالب میں ملا دی تھیں[1] ۔ سید محمد اسماعیل رسا ہمدانی نے غالب کے نام سے خطوط لکھ کر ''نادر خطوط غالب'' کے نام سے شائع کیے تھے اس کتاب میں ستائیس خط تھے، جن میں صرف ایک غالب کا تھا اور باقی جعلی تھے[2]۔

اردو میں ایسے واقعات تو بہت ہوئے ہیں کہ شاگرد استاد کی زندگی میں رشتۂ تلمذ سے منکر ہو گیا ہو ۔ ایسے بھی کچھ واقعات ہیں کہ کسی مشہور شاعر کی وفات کے بعد بعض شاعروں نے اس سے تلمذ کا دعویٰ کیا لیکن شاید ایسی مثال کوئی نہ ہو کہ بڑے شاعر کی زندگی ہی میں کچھ لوگ اس سے تلمذ کا دعویٰ کریں ۔ لیکن سید محمد فخرالدین حسین خاں سخن دہلوی اور شاہ باقر علی باقر بہاری نے ایسی مثال بھی قائم کی ہے ۔

ان دونوں کو غالب سے تلمذ نہیں تھا ۔ لیکن انھوں نے غالب کی زندگی ہی میں تلمذ کا دعویٰ کیا بلکہ سخن تو اور آگے بڑھ گئے ۔ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ غالب ان کے ''نانا'' تھے ۔ ہؤا یوں کہ غالب کی ''قاطع برہان'' کے جواب میں کلکتے کے ایک مدرس آغا احمد علی احمد نے ''موید برہان'' لکھی ۔ ابھی یہ کتاب غالب تک نہیں پہنچی تھی کہ کچھ احباب نے غالب کو اس کتاب کے بارے میں لکھا اور اس کے کچھ مندرجات سے آگاہ کیا ۔ غالب نے جواباً ایک

۱۔ اس سلسلے میں محققانہ بحث کے لیے ملاحظہ ہو ، نادم سیتاپوری ، غالب کے کلام میں الحاق عناصر ، لکھنؤ ، ۱۹۶۵ ، ص ص ۱۳۹ - ۲۱۹ -

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''نادر خطوط غالب'' (تبصرہ) قاضی عبدالودود ، معیار (پٹنہ) جنوری ۱۹۴۳ع

قطعہ لکھا جس کا مطلع تھا :

مولوی احمد علی، احمد تخلص، نسخہ
در خصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است

اس کے جواب میں مولوی احمد علی کے ایک شاگرد عبدالصمد فدا نے ایک قطعہ لکھا (اس قطعے کے بارے میں "ہنگامہ دل آشوب" کی پہلی جلد میں لکھا گیا ہے کہ یہ خود مولوی احمد علی ہی کی تصنیف ہے) ۔ مولوی باقر علی باقر اور سخن نے اس قطعہ کا جواب لکھا اور یہ تمام قطعے ہنگامہ دل آشوب جلد اول کے نام سے ۵ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۶۷ع کو شائع ہوئے ۔ اس میں سخن کے نام کے ساتھ تلمیذ و نبیرۂ غالب لکھا گیا ہے ۔ ہنگامۂ دل آسوب کی دوسری جلد ۲ جمادی الاول ۱۲۸۴ھ مطابق یکم ستمبر ۱۸۶۷ع کو شائع ہوئی ۔ اس میں منشی جواہر سنگھ جوہر کا قطعہ، اس کے جواب میں باقر اور سخن کے قطعے، سخن اور باقر کے قطعوں کے جواب میں عبدالصمد فدا کا قطعہ پھر اس کے قطعہ کے جواب میں باقر اور سخن کے قطعے ، منشی محمد امیر امیر کا قطعہ شامل تھا ۔ اس کے علاوہ سخن کی ایک اور نثر بھی تھی جو میر آغا علی شمس لکھنوی کی ایک تحریر مطبوعہ اودھ اخبار مورخہ ۲۵ جون ۱۸۶۸ع کے جواب میں تھی ۔ اس تحریر میں سخن نے لکھا ہے :

"حضرت غالب مدظلہ العالی کا نواسہ اور شاگرد ہوں ۔ میں نے بھی علم عربی کا حافظ عبدالرحمن مغفور اور مولوی محمد علی صاحب دہلوی سے حاصل کیا[۱] ۔"

غالب کے سوانح نگار اگر ذرا غور سے سخن کے خاندان اور ان کے بزرگوں کا حال پڑھیں تو باسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا ہرگز کوئی رشتہ نہیں تھا اور سخن نے صریحاً غلط لکھا ہے کہ وہ غالب کے نواسے ہیں[۲] ۔ جو شخص اتنا بڑا جھوٹ اور اس دلیری سے بول سکتا ہے ، اس کے لیے یہ کہنا تو کچھ

۱۔ ہنگامہ دل آشوب ، اردو ، جنوری ۱۹۳۷ع ص ۸۳ ۔

۲۔ مالک رام سے ہماری یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ خاندان غالب کے تمام افراد سے بخوبی واقف ہیں ۔ وہ سخن کی غلط بیانی پر یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ غالباً ان کی غالب سے کچھ رشتہ داری تھی تھی ۔ یہ انہیں اپنا جد فاسد یعنی نانا لکھتے تھے ۔ لیکن صحیح رشتہ متعین نہیں ہو سکا (تلامذۂ غالب ص ۱۴۸) یہاں "غالباً" اور "کچھ رشتہ داری" جیسے الفاظ محقق کو زیب نہیں دیتے ۔

مسکل ہی نہیں کہ وہ شاگرد غالب ہے ۔ در اصل قاطع برہان کے سلسلے میں غالب پر بہت لے دے ہو رہی تھی ۔ سخن کٹر متعصب دلی والے تھے ۔ انھیں اصل بحث کا قطعی علم نہیں تھا ۔ انھوں نے سرے سے ''موید برہان'' نہیں دیکھی تھی ۔ انھوں نے تو غالب کا قطعہ اور اس سلسلے میں دوسرے قطعات دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ ایک دہلی والے پر بعض لوگ اعتراضات کرتے ہیں ۔ چنانچہ ہنگامہ' شہر آشوب میں انھوں نے غالب کی طرف داری کم اور اہل دہلی کی زیادہ کی ہے ۔ بلکہ اہل لکھنؤ کو بے وجہ برا بھلا کہا ہے ۔ مثلاً ''قاطع برہان'' کی بحث میں یہ لکھنا قطعی بے موقع بات ہے :

''آپ اگر لکھنؤ میں خوش باش ہیں تو میں وکیل ہوں ۔ آپ کو اگر اپنی زبان دانی کا دعویٰ ہے تو ایسی زبان دہلی کے عوام الناس بولتے ہیں ، لکھنؤ کے فصیحوں کا دم بند کرتے ہیں ۔ وہاں کے شعرا بر از راہ اعتراض زبان کھولتے ہیں ۔ لکھنؤ کے افصح الفصحا مرزا رجب علی بیگ سرور تخلص نے کتاب فسانہ عجائب تالیف کی ۔ میں نے ''سروش سخن'' ان کے جواب میں تصنیف کی ۔''

سخن کے لیے یہ موقع بہت اچھا تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ چونکہ وہ غالب کی طرفداری کر رہے ہیں اس لیے اگر خود کو ''تلمیذ و نبیرہ غالب'' لکھیں تو غالب ہرگز تردید نہیں کریں گے ۔ انھوں نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے دوست[۲] باقر کو بھی تلمیذ غالب لکھ دیا ۔ مجھے یہ شبہہ ہے کہ غالب کو ہنگامہ دل آشوب'' کے شائع ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی ۔ اس کتاب کی پہلی جلد ۱۰ اپریل ۱۸۶۷ع کو چھپی تھی ۔ ظاہر ہے کہ اس میں شامل قطعات کچھ مہینے پہلے ہی لکھے گئے ہوں گے ۔ اس کتاب میں غالب کا جو قطعہ شامل ہے اس کے بارے میں وہ ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ع کو یعنی ہنگامہ' دل آشوب کی اشاعت سے تین مہینے پہلے میر حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں :

''بس بھائی میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا[۳] ۔''

۱- ہنگامہ' دل آشوب ، اردو ، جنوری ۱۹۳۷ع ص ۸۳ -

۲- باقر کے بارے میں سخن لکھتے ہیں ''مگر جناب مستغنی الالقاب مخدومی مکرمی مولوی باقر علی صاحب جن کو ہمارے حضرت ہادی پیر و مرشد مد ظلل جلالہ کے حضور سے ملک الشعرا کا خطاب ہے سروش سخن ، ص ۲۸۶ -

۳- خطوط غالب ، ص ۴۶۳ -

''ہنگامہ' دل آشوب'' کی جلد اول کے شائع ہونے سے چند روز پہلے یعنی ۱۳ ، مارچ ۱۸٦۷ع کو غالب موید برہان کے بارے میں ذکا کو لکھتے ہیں :

''موید برہان میرے پاس بھی آ گئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں ۔ وہ تمھارے پاس بھیجوں گا، شرط مودت ، بشرط آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو ۔ یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب لکھو ، میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو درج کردو[1] ۔''

اگر سخن اور باقر کو غالب سے تلمذ تھا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ چھپنے سے پہلے یہ قطعات غالب کو نہ بھیجتے، اور ایسی صورت میں یہ ممکن نہ تھا کہ غالب ذکا کے نام اس خط میں قطعات اور ہنگامہ' دل آشوب کی اشاعت کا ذکر نہ کرتے۔ غالب کو طرف داروں کی ضرورت تھی ۔ نوبت یہاں تک تھی کہ وہ خود جواب لکھ کر شاگردوں کے نام سے چھاپ رہے تھے ، اور بعض شاگردوں کو سواد فراہم کر رہے تھے ۔ ہم اگر یہ مان بھی لیں کہ سخن اور باقر نے چھپنے سے پہلے قطعات غالب کو کسی مجبوری سے نہیں دکھائے ، تو چھپنے کے بعد تو کتاب بھیجی ہوگی ۔ پھر غالب کے خطوط میں اس کتاب کا ذکر کیوں نہیں ملتا ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہنگامہ' دل آشوب کی دوسری جلد یکم ستمبر ۱۸٦۷ع کو شائع ہوئی ۔ اگر غالب کو ہنگامہ' دل آشوب کی پہلی جلد موصول ہوئی ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسری جلد میں غالب کے مشورے شامل نہ ہوتے ۔ دوسری جلد میں انتہائی سطحی باتیں ہیں ، جن کا اصل موضوع یعنی غالب کی قاطع برہان اور مولوی احمد علی کی موید برہان سے قطعی کوئی تعلق نہیں ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہنگامہ دل آشوب کی پہلی جلد غالب کو بھیجی ہی نہیں گئی ۔

سخن کا سنہ ولادت کسی کو معلوم نہیں ۔ مالک رام نے بغیر کسی حوالے یا بحث کے ''لگ بھگ ۱۸۴٦ع[2]'' لکھا ہے ۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے بعض شواہد کی روشنی میں قیاساً ۱۸۴۰ع[3] بتایا ہے ۔ خود سخن کا بیان ہے کہ

۱۔ خطوط غالب ، ص ۳٦۵ ۔

۲۔ تلامذہ' غالب ، ص ۱۳۷ ۔

۳۔ سروش سخن ، ص ۵ ۔

۱۸۵۳ء میں انھوں نے دہلی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ پہلی صورت میں ان کی عمر گیارہ برس اور دوسری صورت میں تیرہ برس قرار پاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ نا ممکن ہے کہ سخن نے گیارہ یا تیرہ سال کی عمر میں شاعری میں ایسی مشق بہم پہنچائی ہو کہ استاد کی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۸۵۰ء (سخن کے ترک وطن) اور ۱۸۶۹ء (وفات غالب) کے درمیانی سولہ برس میں سخن نے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لی ہوگی۔ سخن نے غالب کی ایک تقریظ کو تو چھپنے سے پہلے سترہ سال تک محفوظ رکھا (اس تقریظ پر بعد میں بحث ہوگی) لیکن اپنے استاد، جن کے ادبی مرتبے سے وہ بخوبی واقف تھے اور جنھیں وہ ''حضرت جناب تقدس مآب، گردوں رکاب سر دفتر محققان سخن، افسر شاعران زمن . . . سرآمد شاعران حال و گزشتگان''[۱] لکھتے ہیں، ان کا ایک خط بھی محفوظ نہیں رکھ سکے۔ خطوطِ غالب کے کسی مجموعے میں سخن یا باقر کے نام ایک بھی خط نہیں اور نہ ان کے نام ہی کسی اور خط میں آئے ہیں۔ سخن نے سروشِ سخن اور دیوان سخن دونوں میں یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ شاگرد غالب ہیں۔

سروشِ سخن کا پہلا ایڈیشن ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایڈیشن بالکل نہیں ملتا۔ اس لیے یقین سے کہا نہیں جا سکتا کہ اس میں دعویٰ تلمذ کیا گیا تھا یا نہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس ایڈیشن میں نہ ہوگا۔ دوسرے ایڈیشن[۲] میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مرزا نوشہ . . . جو جد فاسد محرر داستان ہیں، سرآمد شاعران حال گزشتگان ہیں عرصہ دراز تک کم ترین کو معظم الیہ سے درس و تدریس میں استفادہ رہا۔ تحریر نظم و نثر پارسی اور اردو کی مزاولت پر دل آمادہ رہا[۳]۔''

سخن اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> چندے درک صحبت ایشاں نمودہ ام ایں ہمہ سخن گستری فیض تجلیات پہاں مہر سپہر سخنوریست[۴]۔''

۱۔ سروشِ سخن ص ۲۸۳۔
۲۔ خلیل الرحمان داؤدی نے جو سروشِ سخن مرتب کی ہے، اس کا متن دوسرے ایڈیشن پر مبنی ہے۔
۳۔ سروش سخن ص ۲۴۔
۴۔ دیوان سخن دہلوی، ص ۳۔

ان دونوں اقتباسوں میں صرف ''عرصہ دراز'' اور ''چندے درک صحبت ایشان نمودہ ام'' کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے ۔

اب بعض تذکرہ نگاروں کو لیجیے ۔ علی نجف نے اپنی کتاب تذکرہ ''غنچۂ ارم'' میں سخن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

''و منظور نظر عاطفت بندگان حضرت مولوی سید خواجہ فخر الدین حسین دہلی مولد ، لکھنؤ و آرہ مسکن ، مصنف سروشِ سخن و متخلص بہ سخن ، خلف الصدق جناب جلال الدین احمد المدعو بہ حضرت صاحب دام مجدھم ، برادر زادہ و پسر خواندہ خواجہ صاحب مغفور منصف پورینہ مامور بودہ ، بہ حصول رخصت وارد آں جا شدہ بودند و بعد از انصرام رخصت عزیمت مقام مذکور داشتند ، گردیدم و بر حسب ارشاد ممدوح الیہ ہم رکاب آں جناب فائز پورینہ گشتہ مورد ہزاراں عنایت و کرم شدم تا دو سال خدمت سامی مفخر بودم[۱]۔''

نجف کے اس بیان سے لگتا ہے کہ وہ سخن کی بہت عزت کرتا ہے اور اُن کے خاندان کا بہت ممنون ہے ۔ یہ کتاب ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ع میں تالیف ہوئی تھی اور ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ع میں شائع ہوئی تھی[۲]۔ اس وقت تک ہنگامہ دل آشوب اور سروشِ سخن شائع ہو چکی تھیں جن پر سخن کو شاگرد و نبیرۂ غالب لکھا گیا تھا ۔ نجف نے سخن کے بارے میں دونوں میں سے کوئی بات نہیں لکھی ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اصل راز سے واقف تھے ۔

عبدالغفور نساخ نے لکھا ہے :

''شاگرد مرزا نوشہ غالب ، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ان کو اپنا شاگرد بتلاتے ہیں ۔ کلام ان کا لکھنویوں کے انداز کا ہے ۔ کوئی شعر یا کوئی فقرہ نثر دہلویوں کے انداز کا ان کے کلام میں نظر نہیں آتا ۔[۳]''

نساخ کے اس بیان میں دو باتیں اہم ہیں ۔ ایک تو یہ کہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ، سخن کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں ۔ نساخ کا یہ بیان کہ ''کوئی فقرۂ نثر دہلویوں کے انداز کا ان کے کلام میں نہیں'' اس بات کا ثبوت ہے کہ نساخ کو اگر یقین نہیں تو شبہہ ضرور تھا کہ سخن کو غالب سے تلمذ نہیں ، ورنہ نساخ کے یہ الفاظ بے معنی ہیں ۔

یہ حقیقت ہے کہ صفیر مدعی تھے کہ سخن اُن کے شاگرد ہیں ۔

۱- سروشِ سخن ، ص ۱۳ ، ۱۴ -

۲- سخن شعرا ، ص ۲۱۲ -

مرزا غلام حیدر مجروح عظیم آبادی نے ایک قطعے میں شاگردانِ صفیر بلگرامی کی فہرست دی ہے ۔ اس میں سخن کا بھی نام آیا ہے اور شعر متعلقہ یہ ہے :

فیض یاب از صفیر با تمکین
سخن ، احمد ، امیر ، سلطاں ، شاد[۱]

یہ تو ممکن ہے کہ ایک شاگرد اپنے استاد سے انحراف کر لے اور شاگردی سے منکر ہو جائے ۔ اردو میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ۔ اور شاید یہ ممکن بھی نہیں کہ کوئی شاعر خواہ مخواہ کسی دوسرے کو اپنا شاگرد بتائے ۔ صفیر اور سخن میں اس موضوع پر اچھا خاصا معرکہ ہوا تھا ۔

نواب سید تجمل حسین خاں سلطان عظیم آبادی نے ایک کتاب ''مرقع فیض'' لکھی جو شاگردان صفیر کا تذکرہ تھا ۔ اس میں شاد عظیم آبادی اور سخن کا بھی ذکر تھا[۲] ۔

اس کتاب کے جواب میں تنبیہ صفیر بلگرامی مصنفہ سردار مرزا شائع ہوئی ۔ بقول سید وصی احمد بلگرامی اس کے اصل مصنف خود سخن تھے[۳] ۔ میں اس کے مصنف کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ اگر سید وصی احمد بلگرامی کا بیان غلط ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ اس کے لکھے جانے میں سخن کا ہاتھ تھا ۔ کیونکہ تنبیہ صفیر بلگرامی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو :-

''سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

سخن نے (یہ شعر) دہلی ہی میں کہا تھا اور غالب نے اسے سن کر انھیں گلے لگایا تھا اور آبدیدہ ہوکر کہا تھا ''میری جان ایسے شعر نہ کہا کرو ۔ ابھی تو تم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا ۔ دنیا میں کیا دیکھا بھالا ۔ دیکھو عارف ایسے ہی لخت جگر اُگل کر دنیا سے ناشاد گیا ۔ تم بھی زندگی سے بیزار ہو ۔ الغرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی کہ

۱- ''س ش ص''، سید وصی احمد بلگرامی، قومی زبان (کراچی) اکتوبر ۱۹۶۸ع ص ۲۷ -

۲- مرقع فیض اور تنبیہ صفیر بلگرامی کے مندرجات کے متعلق معلومات قومی زبان کراچی دسمبر ۱۹۶۸ع سے لی گئیں ۔ اصل کتابیں مجھے نہیں مل سکیں ۔ (خ ۔ ا)

۳- قومی زبان ، (کراچی) دسمبر ۱۹۶۸ع ، ص ۶۳ -

خبردار . . . اب جو سنوں گا کہ ایسا شعر کہا ہے تو سید تیری جان
اور اپنے ایمان کی قسم صورت سے بیزار ہو جاؤں گا[۱]''۔

لطف یہ ہے کہ صفیر دعویٰ کرتے تھے کہ سخن اُن کے شاگرد ہیں۔ جواباً سخن نے یہ دعویٰ کیا کہ صفیر کو اُن سے تلمذ ہے۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صفیر مدعی تھے کہ سخن کو اُن سے تلمذ ہے اور وہ اس حقیقت سے منکر ہیں کہ سخن کو غالب سے تلمذ ہے ورنہ وہ یہ ضرور لکھتے کہ سخن پہلے غالب کے اور اب آن کے شاگرد ہیں۔ اس کے برعکس سخن کا یہ دعویٰ کہ صفیر اُن کے شاگر ہیں، صریحاً بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اول تو صفیر سخن سے عمر میں لگ بھگ دس سال بڑے تھے۔ اور دوسرے سروش سخن میں سخن نے لکھا تھا:

''سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی جو صاحب دیوان ہیں، تحریر اُن کی چست، روزمرہ درست نہایت خوش بیان ہیں۔ ہر شہر و دیار میں اُن کی علو خاندانی کی شہرت ہے، ہر جگہ اُن کی قدر و منزلت ہے۔۔[۲]''۔

اگر صفیر کو اُن سے تلمذ تھا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ یہاں اُس کا ذکر نہ کیا جاتا۔

لالہ سری رام کا تذکرہ ''خم خانہ جاوید'' کی چوتھی جلد ۱۹۲۶ع میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت سخن کی تمام تصنیفات شائع ہو چکی تھیں۔ ان تصنیفات میں سخن کا دیوان بھی شامل ہے جس میں غالب کی ایک تقریظ ہے اور جس تقریظ میں غالب نے لکھا ہے کہ میں سخن کا ''جد فاسد'' یعنی نانا ہوں۔ لالہ سری رام کے پیش نظر وہ ادبی معرکے بھی رہے ہوں گے جو سخن اور صفیر میں رہے تھے۔ اب اُن کا بیان ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

[۳]''(سخن) ان کو جس طرح فن سخن میں مرزا غالب سے عقیدت تھی، اسی طرح مرزا صاحب سے کچھ قرابت بھی ظاہر فرماتے۔ مگر یہ بات

۱۔ غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام، قاضی عبدالودود، آئینہ غالب، ص ۱۰۰ - ۱۰۱ -

۲۔ سروش سخن، ص ۲۹۰ - ۲۹۱ -

۳۔ مالک رام نے تلامذہ غالب میں سخن کے حالات لکھے ہیں۔ اُن کے مآخذ میں خم خانہ جاوید بھی ہے۔ لیکن انھوں نے لالہ سری رام کے اتنے اہم بیان کو قطعی ظاہر نہیں کیا۔

سخن آرائی کے تحت میں رہی اور پایۂ ثبوت کو نہ پہنچی[۱] ۔"

اس سلسلے میں اب کچھ اور شواہد ملاحظہ ہوں ۔

سروش سخن میں سخن نے غالب کا نام اس طرح لکھا ہے :

"نجم الدولہ ، دبیرالملک ، نواب اسداللہ خان بہادر سیراب جنگ عرف مرزا نوشہ[۲] ۔"

جو لوگ غالب کی شخصیت اور اُن کی ۱۱ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ غالب کا شاگرد اور کم از کم نواسا اُن کا نام لکھنے میں غلطی نہیں کر سکتا ۔ سخن دیوان غالب کے بارے میں لکھتے ہیں :

"دیوان اردو جب تصنیف فرمایا معنی رس اور سخن دان لوگوں نے ایک ایک شعر میں سو سو طرح کا مزہ پایا ۔ لیکن بعضے شاعر جو بڑے مشاق تھے ، اپنے فن میں طاق ، شہرہ آفاق تھے ، اکثر اشعار نہ سمجھے اور ہر ایک مصرع پر الجھے، یہاں تک کہ اضلاع اور امصار سے خطوط آنے لگے ۔ لوگ نواب صاحب کی خدمت میں مطلب دریافت کرنے جانے لگے ۔ آسان اشعار کہنے کی فرمایش ہوئی ۔ دوسرا دیوان مرتب کرنے کی خواہش ہوئی ۔ آپ نے اس دیوان کو دریا برد کیا اور دوسرا دیوان موافق فہم ابنائے روزگار کے ترتیب دیا ۔ پھر یہ رباعی لکھ کر لوگوں کو سنا دی اور دیوان کے آخر میں لگا دی ۔ غالب مدظلہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل"[۳] !

غالب نے اردو میں پہلا دیوان (نسخۂ بھوپال) ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ع) میں مرتب کیا تھا ۔ اس کے شائع ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی جو اضلاع و امصار سے خطوط آئے ۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس نسخے کی بہت نقلیں کی گئی تھیں ۔ اسی نسخے کی ایک نقل نسخۂ شیرانی ہے جس میں غالب نے کچھ ترمیم کی

۱- خم خانۂ جاوید ، ج ، ص ۱۳۹ -

۲- سروش سخن ص ۲۸۳ -

غالب کے نواسے اور ایسے پیارے شاگرد ، جسے غالب گلے لگا کر آبدیدہ ہوئے ۔ اس کو یہ علم نہیں کہ غالب کا خطاب نظام جنگ تھا ، سیراب جنگ نہیں ۔

۳- سروش سخن ، ص ۲۸۴ -

تھی - کچھ غزلیں نکالی تھیں اور کچھ اضافہ کی تھیں - لیکن بنیادی طور پر یہ پہلے ہی دیوان کی نقل تھی' اور اس کے قلمی نسخے بھی اضلاع اور امصار میں نہیں پہنچے - متداول دیوان البتہ کلام غالب کا انتخاب ہے جو غالب نے خود ۱۲۴۸ھ میں کیا تھا - یہی دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ع میں شائع ہوا تھا اور اضلاع و امصار میں پہنچا تھا - اس کا دوسرا اڈیشن ۴۷ ۱ع میں شائع ہوا - اس میں غزلیں حذف نہیں کی گئی تھیں بلکہ پندرہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا تھا - رباعی کے متعلق جو کچھ سخن نے کہا ہے وہ محض افسانہ ہے - یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ اُن لوگوں کے لیے کہی گئی تھی جو غالب پر مشکل گوئی کا اعتراض کرتے تھے ، لیکن یہ اس دیوان (نسخۂ بھوپال) میں شامل تھی[۲] جو غالب نے سب سے پہلے مرتب کیا تھا - سخن ۱۸۵۳ع میں دہلی سے آئے ہیں - اس وقت تک اُن کے نانا اور استاد کے دیوان اردو کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور وہ اس کی روداد سے ناواقف ہیں - اور سروش سخن کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۷۷ع) تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں - اب غالب کی فارسی تصنیفات کے بارے میں سخن کا بیان ملاحظہ ہو :

> ''تواریخ مہر نیم روز'' اور ''ماہ نیم ماہ'' حسب الحکم شاہ ثریا جاہ از آغاز پیدائش حضرت آدم تا زمان صاحب قرآن ثانی امیر گورگانی اور دوسری جلد میں وہاں سے عہد بہادر شاہ تک ایک مہینے کے عرصے میں اس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ لکھی کہ سب استادوں نے آپ کے آگے قلم رکھ دیا . . . . اتنی بڑی تاریخ کو دو جلدوں میں اور دو جلدوں کو اٹھارہ جزو میں تمام کیا[۳] -''

حیرت ہے کہ غالب کے نواسے کو یہ بھی علم نہیں کہ اس تاریخ کا دوسرا حصہ یعنی ''ماہِ نیم ماہ'' شائع ہونا تو کجا لکھا ہی نہیں گیا - غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ع کو خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تھے - اور اگست ۱۸۵۴ع میں ''مہر نیم روز'' مکمل ہوئی تھی - گویا پورے چار سال میں - یہ وہ زمانہ ہے جب سخن غالب سے درس و تدریس لے رہے ہیں اور شاعری میں اصلاح لے رہے ہیں - لیکن انھیں اس کا علم نہیں کہ غالب کو یہ پہلا حصہ

۱- دیوان غالب ، نسخۂ عرشی ، ص ۲۴ -

۲- نسخۂ حمیدیہ ، ص ۳۴۰ -

۳- سروش سخن ، ص ۲۸۴ -

لکھنے میں کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا ۔ اور انھیں یہ بھی نہیں پتہ کہ اس تاریخ میں امیر تیمور تک نہیں ، ہمایوں تک کے حالات ہیں ۔ یہ کتاب ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ع-۱۸۵۵ع) میں شائع ہوگئی تھی[۱]۔ سخن کو یہ توفیق بھی نہیں ہوئی کہ اپنے استاد کی اس کتاب پر ایک نظر ڈال لیتے ۔

کلیات نثر

اب پنج آہنگ کے بارے میں اُن کا بیان ملاحظہ ہو ۔ لکھتے ہیں ۔

''انشاے پنج آہنگ کو کہ جس میں صدہا مکتوب ہیں ، تین روز میں تصنیف کیا''۔[۲]

پنج آہنگ کے بارے میں یہ بیان صرف وہ شخص دے سکتا ہے ۔ جس نے کبھی یہ کتاب نہ دیکھی ہو اور جس کا غالب سے قریبی تعلق نہ رہا ہو ۔ اس کا پہلا اڈیشن ۲ اگست ۱۸۴۹ع کو شائع ہو چکا تھا ۔ جب ۱۸۵۳ع میں سخن نے دھلی کو خیر باد کہا ہے تو اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا تھا ۔ اس کے باوجود سخن کو اس کے مندرجات کا علم نہیں ۔ اور یہ معلوم نہیں کہ اس کتاب میں غالب کی جو تحریریں ہیں وہ تین روز میں نہیں لکھی جا سکتی تھیں ۔ بلکہ اُن کا زمانہ تصنیف ۱۸۲۵ع - ۱۸۴۹ع تک ہے اور خطوط صرف آہنگ پنجم میں ہیں ۔

سروش سخن کا سنہ تصنیف ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ع میں بتایا جاتا ہے ۔ اس سے قبل غالب کا کلیات نظم فارسی ۱۸۴۵ع میں قاطع برہان ۱۸۶۲ع میں شائع ہو چکے تھے اور سخن کو ان کی اطلاع نہیں ۔ مثنوی باد مخالف کے بارے میں لکھا ہے :

''مثنوی باد مخالف جو کلکتہ میں رقم فرمائی ، اسے ایک دن میں تالیف کیا[۳]۔''

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ غالب نے کہیں لکھا ہو کہ یہ مثنوی ایک دن میں لکھی گئی ۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ مثنوی بھی سخن کی نظر سے نہیں گزری تھی ، انھوں نے صرف اس کا نام سنا تھا ۔

۱- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں : مکاتیب غالب ، صفحہ ۳۹-۴۰ - ذکر غالب ، صفحہ ۱۴۷-۱۵۲ -

۲- سروش سخن ، صفحہ ۲۸۵ -

۳- ایضاً ، صفحہ ۲۸۵ -

ان دلائل سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سخن کا غالب سے کسی طرح کا کوئی رشتہ نہیں تھا ۔ وہ نہ غالب کے شاگرد تھے اور نہ نواسے انھوں نے قاطع برہان کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر خود کو تلمیذ غالب لکھا اور اس سلسلے میں اپنے دوست باقر علی باقر کو بھی تلمیذ غالب لکھ دیا ۔ اب مسئلہ اس تقریظ کا رہ جاتا ہے جو دیوان سخن میں غالب کے نام سے ہے ۔ پہلے تقریظ ملاحظہ ہو:

''نام خدا سلطان قلمرو سخن دیوان خاص میں رونق افزا ہوا ہے ۔ اور نگاہ روبرو بادشاہ سلامت کا شعور ہر طرف برپا ہوا ہے ۔ اہل نظر بادشاہ کا حسن و جمال اور بارگاہ کی عز و شان دیکھیں ۔ سخنوروں کے ہزاروں دیوان دیکھے ہوں گے ، اب سخن کا خاص دیوان دیکھیں ۔ رہے شاعر یکتا و نامی کہ جس کا پیارا نام سخن ہے یعنی ہمہ تن سخن اور تمام سخن ہے ۔ قرۃالعین خواجہ سید محمد فخرالدین حسین کو اگر سخن ور بیعدیل کہوں تو بجا ہے کیونکہ اس کا حسن کلام میرے دعوے پر دلیل اقویٰ ہے ۔ اس سحر کار جادو نگار نے پری زادان معنی کو الفاظ کے شیشوں میں اس طرح اوتارا ہے جیسے آبگینۂ مے سے رنگ مے نظر آئے ، لفظ سے جلوہ معنی آشکارا ہے ۔ میں مغلوب دہر غالب نام جو بازار ہستی میں متاع کاسد ہوں ، بحسب اصلاح فقہا اس سید زادہ قدسی نہاد کا جد فاسد ہوں ۔ چشم بد دور ہنوز آغاز جوانی اور نو بہار باغ زندگانی ہے ۔ عمر کے لیے دفتر قضا و قدر میں حکم دوام لکھا گیا ہے ۔ پس اگر یہی جودت فکر اور طبیعت کی روانی ہے ، اغلب کہ ذوق شعر اور شغل تحریر ہمیشہ چلا جائے گا ۔ پھر تو یہ دیوان اوراق افلاک میں نہ سمائے گا ۔''

غالب کی وفات ١٨٦٩ع میں ہوئی اور یہ دیوان ستمبر ١٨٨٦ع میں مطبع نول کشور سے شائع ہؤا ۔ اس دیوان میں شاہ محمد عزیزالدین عزیز کا کہا ہوا ''قطعۂ تاریخ ترتیب دیوان سخن دہلوی'' شامل ہے جس سے ١٣٠٢ھ مطابق ١٨٨٤ع برآمد ہوتا ہے ۔ گویا یہ دیوان ١٨٨٤ع میں مرتب ہوا ۔ پھر غالب نے سترہ سال پہلے کس طرح اس کی تقریظ لکھ دی ۔ کہا جا سکتا ہے کہ عزیز کا قطعہ غلط ہے ۔ یہ دیوان غالب کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا ، چھپا بہت بعد میں ہے ۔

سخن خود ہنگامۂ شہر آشوب میں لکھ چکے ہیں :

''آپ نے چند غزلیں کہی ہوں گی ، میں صاحب دیوان ہوں ۔''

پھر سخن اپنے دیوان میں لکھتے ہیں :

نظم پریشاں مری جبکہ ہوئی مجتمع
شانۂ کش طرہ زلف شکن در شکن
لوگوں کا اصرار پھر مجھ سے ہوا بہر طبع
اور نہ دی رخصت یک مژہ برہم زدن
چھپ گئے جو کچھ کہ تھے شعر برے یا بھلے
ہو گئے المختصر ہدیۂ ارباب فن

سخن کا پہلا بیان ۱۸۶۷ع کا ہے اور دوسرا ۱۸۸۶ع کا ۔ ظاہر ہے کہ پہلے بیان میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے ۔ فرض کیجیے ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ غالب کی زندگی میں دیوان مرتب ہو چکا تھا اور غالب ہی نے یہ تقریظ لکھی تھی ، تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ جب ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ع کو عود ہندی شائع ہوئی تو اس میں غالب کی تقریظ شامل نہیں ہوئی ۔ ہم یہ بھی مان لیں کہ سخن کی کوتاہی سے یہ تقریظ عود ہندی میں شامل نہیں ہوئی تو ۱۸۹۹ع میں حالی نے جب اردوے معلی کے حصہ دوم کے لیے مواد فراہم کیا تھا ۔ جس میں تقریظیں ، دیباچے اور کچھ خطوط شامل تھے ، اس وقت دیوان سخن کو شائع ہوئے چودہ پندرہ برس گذر چکے تھے ۔ سروش سخن کی وجہ سے سخن کو اچھی خاصی شہرت مل چکی تھی ۔ پھر حالی نے یہ تقریظ اردوے معلی میں کیوں شامل نہیں کی ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اصل راز سے واقف تھے ۔ غلام رسول مہر صاحب نے خطوط غالب میں یہ شامل کی ہے ۔ معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ سخن اور باقر دونوں غالب کے جعلی شاگرد ہیں ۔ انھوں نے غالب کی مقبولیت اور شہرت کا فائدہ اٹھایا ہے ۔ اور اس تقریظ کا بھی غالب سے کوئی تعلق نہیں ، یہ سخن کی اپنی تصنیف ہے ۔

۱۔ نادم سیتاپوری ، غالب کے کلام میں الحاقی عناصر ، لکھنؤ ، ۱۹۶۵ع ۔
۲۔ معیار (پٹنہ) جنوری ۱۹۴۳ع ۔
۳۔ ہنگامہ دل آشوب ، اردو جنوری ۱۹۳۷ع ۔
۴۔ مالک رام ، تلامذہ غالب ، نکودر ، (سنہ طباعت نہیں دیا گیا) ۔

۵- مالک رام ، ذکر غالب ، بار سوم ، دہلی ، ۱۹۵۵ء -
۶- سید محمد فخر الدین حسین سخن ، سروش سخن ، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی ، لاہور ، (سنہ طباعت نہیں دیا گیا) -
۷- سید محمد فخر الدین حسین سخن ، دیوانِ سخن دہلوی ، مطبع نول کشور، ۱۸۸۶ء -
۸- غالب ، خطوطِ غالب ، بار ۲ ، مرتبہ غلام رسول مہر لاہور ، (سنہ طباعت نہیں دیا گیا) -
۹- خلیق انجم ، غالب کی نادر تحریریں دہلی ، ۱۹۶۱ء -
۱۰- عبدالغفور نساخ ، سخنِ شعرا ، مطبع نول کشور ، ۱۸۷۴ء -
۱۱- س ش ص ، سید وصی احمد بلگرامی ، قومی زبان (کراچی) اکتوبر ۱۹۶۸ء ، نومبر ۱۹۶۸ء ، دسمبر ۱۹۶۸ء - یہ مقالہ پہلے ''ندیم'' گیا کے بہار نمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا -
۱۲- سری رام ، خم خانہ جاوید ، جلد ۴ ، ۱۹۲۶ء -
۱۳- دیوانِ غالب ، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی ، علی گڑھ ، ۱۹۵۸ء -
۱۴- دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق ، بھوپال ، (سنہ طباعت نہیں دیا گیا) -
۱۵- مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی ، بمبئی ، ۱۹۳۷ -
۱۶- آئینۂ غالب ، مرتبہ پبلیکیشنز ڈویژن دہلی ۱۹۶۴ء -

شوکت سبزواری

غالب اور اصولِ لغت نگاری

لغت نگاری (Lexicography) کسی زمانے میں ایک فن تھا جس طرح شاعری یا انشاپردازی ایک فن ہے۔ لیکن آج لغت نگاری فن سے زیادہ حکمت یعنی سائنس ہے۔ لسانیات کی ایک شاخ جس کا سائنس اور ادب دونوں سے تعلق ہے۔ لغت نگر کے لیے صرف زبان دان ہونا کافی نہیں۔ زبان کی ماہیت، اصلیت، تاریخ، ارتقا، قواعد، لفظوں کے رشتوں اور ان کی صوتی و معنوی تبدیلیوں کا جاننا اور اچھی طرح جاننا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ یہ زبان کی سائنس ہے۔ لغت نگار کی قدیم و جدید ادب پر بھی نظر ہونی چاہیے تاکہ وہ لفظوں کو پہچان کر جامعیت اور اختصار کے ساتھ ان کے معنی بیان کر سکے۔ علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بےشبہ لغت نگاری نے بھی ترقی کی۔ اس کے نئے نئے گوشے اہل علم کے سامنے آئے۔ لیکن غالب کے زمانے میں لغت نگاری اس پائے کی نہ تھی۔ ایک پامال روش چلی آ رہی تھی جسے اہل علم اپنائے ہوئے تھے اور اس سے انحراف بدعتِ ناروا سمجھا جاتا تھا۔

غالب نے کچھ تو اپنی فطری اپج کی وجہ سے، کچھ نامساعد حالات کے زیر اثر جو عموماً بغاوت کے جذبے کو پروان چڑھاتے اور خوابیدہ فطری صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں، جہاں ادب و شاعری میں نئی نئی راہیں نکالیں وہاں زندگی کے دوسرے مشاغل میں بھی رسم و راہِ عام سے ہٹ کر اچھوتے راستے اختیار کیے جو ایک حد تک عام شاہراہ کے متوازی چلے، بعد میں کٹ کر آگے نکل گئے۔ غالب کی ادبی اور علمی زندگی کے ہر شعبے میں جدت اور روشِ خاص کے جلوے نظر آتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے دوران میں غالب سملاًَ کئی ماہ تک اپنے مکان میں محبوس و محصور رہے تھے۔ 'دساتیر' اور 'برہان قاطع' صرف دو کتابیں ان کی رفیقِ تنہائی تھیں جن سے دل بہلایا کرتے تھے۔ لغت سے خاص دلچسپی تھی اس لیے 'دستنبو' کی ترتیب کے بعد ان کا زیادہ وقت 'برہان قاطع' کے تنقیدی مطالعے میں

گزرا اور لغت کے گوناگوں مسائل پر غور کرنے کا انھیں موقع ملا ۔ فکر و تعمق کے بعد لغت نگاری کے کچھ اصول ان کے ذہن میں آئے ۔ ان کی روشنی میں انھوں نے 'برہان' پر تنقید کی اور اس کی بعض لغوی فروگزاشتوں کی ایک یادداشت مرتب کی جو اول ''قاطع برہان'' کے عنوان سے ، بعد میں نظر ثانی اور ضروری اضافوں کے بعد ''درفش کاویانی'' کے نام سے شائع ہوئی ۔

'برہان' پر غالب نے جو تنقید کی اس کی موافقت میں کم ، مخالفت میں زیادہ لکھا گیا ۔ خود غالب کی زندگی میں کئی رسالے شائع ہوئے جن میں غالب پر خوب خوب لے دے کی گئی ، برا بھلا کہا گیا ، اعتراضات ہوئے ، گالیاں دی گئیں ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلنا ہی تھا کہ غالب بھی ، جو اصلاً تُرک اور سپاہی زادے تھے ، گالیوں پر اتر آئیں ۔ مخالفین کا تو کچھ نہ بگڑا ، بقول غالب وہ اس لائق ہی نہ تھے کہ ان کا کچھ بگڑتا ، البتہ غریب 'برہان' کو نوم کر رکھ دیا گیا ۔ آج لوگ غالب کے لہجے کی سختی و درشتی کی شکایت کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ غالب کو بھی ہدفِ مطاعن بنایا گیا تھا ۔ غالب نے اپنے لہجے کی تلخی و تیزی کی معذرت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تیز زبان مخالفوں سے انتقام لینے کے لیے انھیں تلخ اندازِ بیان اختیار کرنا پڑا ۔ فرماتے ہیں :

> ''پوشیدہ نماند کہ آنچہ بعد انضمام دیباچہ دوم در مذمت 'جامع برہان' قاطع سخن تیز تر راندہام وبال این بر گردن مدد گر ناورزیدہ کار اوست کہ در نامہ ترقند ہنگامہ ، خود مرا دشنام داد و بہ بد گفتن محبوب خود دلیری بخشید ۔ اگر گویند کہ انتقام از دہندۂ دشنام بایستے کشید ، گویم ابن بےچارہ در معرض نظم و نثر فرومایہ تر ازانست کہ نامش برند اگرچہ بزشتی باشد ، و صاحبِ 'برہان قاطع' ہرچند بگزاف بود ، نمانمائی دارد ۔''

(درفش ، ص ۲۰)

بحث کا ایک اچھا پہلو بھی تھا جو ہمارے ادب کی بد قسمتی سے لے دے اور شور و غوغا کی نذر ہو گیا ۔ اس پر بہت کم غور کیا گیا کہ لغت نگری کے اصول ، جن کی روشنی میں غالب نے 'برہان' پر تنقید کی ، کیا ہیں ؟ جدید لغت نگاری کی رو سے ان کا کیا درجہ ہے ؟ اور کس حد تک ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ؟ کیا درحقیقت غالب کا نقطۂ نگاہ علمی ہے ؟ کیا 'برہان' پر تنقید کر کے انھوں نے لغت نگاری کو لسانیات کا ایک شعبہ ہونے کی حیثیت سے آگے بڑھایا اور سائنس یا کم سے کم فلسفۂ زبان کے درجے تک پہنچایا ہے ؟

یہ پہلو اس لیے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا کہ غالب کا اصل منشا 'برہان' پر تنقید کرنے سے ، جیسا کہ غالب نے لکھا ہے ، 'برہان' کی تنقیص نہیں ۔

نہ چند الفاظ کی تحقیق و تنقیح ہے بلکہ اصول لغت نگاری کی تدوین و تعیین کے ساتھ ساتھ یہ دکھانا ہے کہ 'برہان' کا انداز لغت نگاری زشت اور ناپسندیدہ ہے۔
''گفتار من در زشتی ہنجار بیان است'' (درفش ، ص ۹م)

اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالب تنقید میں اختصار سے کام نہ لیتے اور ان تمام الفاظ پر جرح کرتے جو ان کی نظر میں درست نہ تھے۔ فرماتے ہیں :

''با ایں ہمہ کوشش کہ در جدا کردن راست از کاست مرا بود نوشتہام مگر از بسیار اندکے ، چنانکہ بےمبالغہ می گویم از صد یکے۔''

(درفش ، ص م)

'برہان' کے علاوہ غالب نے بہار اور قتیل وغیرہ پر بھی ایرادات کیے ہیں اور ان کی روشِ لغت نگاری کو نا مستحکم قرار دیا ہے۔

(۲)

لغت نگاری کی کئی منزلیں یا درجے ہیں۔ اولین منزل اندراج لفظ کی ہے جس کی تشریح کی جاتی ہے اور جس کے معنی بتائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ضبط یعنی اعراب کا درجہ آتا ہے۔ اس میں لفظ کی حرکات بتا کر اس کا صحیح ، قدیم یا جدید تلفظ متعین کیا جاتا ہے۔ لفظ کے ایک سے زیادہ صیغے (Forms) ہوں تو وہ بھی اس سلسلے میں بیان کر دیے جاتے ہیں۔ تیسری منزل میں لفظ کی قواعدی حیثیت زیر بحث آتی ہے۔ چوتھی اور آخری منزل شرح و بیان کی ہے۔ اس میں وہ تمام معانی اور ضمنی مفہوم ترتیب کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں جن میں وہ لفظ مستعمل ہے۔

غالب نے 'برہان' کی تنقید میں لغت نگاری کے تقریباً جملہ مراتب کو سامنے رکھا ہے۔ اس سلسلے میں جو اصولِ لغت ان کے پیش نظر رہے وہ اہل علم کی خصوصی توجہ کے قابل ہیں۔ جدید لغت نگاری کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کس حد تک وہ کھرے اور خالص ہیں۔ کچھ اصول غالب نے 'قاطع' کی ابتدائی تمہیدی سطور میں بیان کر دیے تھے۔ باقی کتاب میں بکھرے ہوئے اور خاص خاص مقامات پر تنقید و تحقیق کے ذیل میں بیان ہوئے ہیں۔

ان اصول پر تفصیلی بحث سے پہلے میں ایک اہم بنیادی نقطے کا ذکر کروں گا جس کی طرف غالب نے خاص طور سے توجہ دلائی ہے؛ وہ یہ کہ لفظ کے جوہر یعنی حقیقت ، ماہیت اور بناوٹ کی معرفت لغت نگاری کی اولین شرط ہے جس کے بغیر لفظ کا اندراج نہیں کیا جا سکتا ، نہ اسے ضبط کیا جا سکتا ہے ، نہ اس کے

مفہوم و معنی کی ٹھیک شرح ہی ہو سکتی ہے ۔ اصولاً کسی زبان کے لغت میں صرف اسی زبان کے الفاظ جگہ پاتے ہیں ۔ دوسری زبان کے وہ الفاظ بھی لیے جا سکتے ہیں جو مستعار یا دخیل ہیں ، یعنی دوسری جگہ سے لے کر زبان میں شامل کر لیے گئے ہیں ۔ جوہر لفظ پر نظر نہ ہو تو اندراج کا معیار کیا ہو گا ۔ یہ کیسے فیصلہ ہو گا کہ لفظ اصیل ہے یا دخیل یعنی اسی زبان کا ہے یا دوسری زبان سے لے کر زبان میں داخل و شامل کر لیا گیا ہے ۔ غالب کو 'برہان' سے یہ شکایت ہے کہ جوہر لفظ پر اس کی نظر نہ تھی ۔ حقیقت سے ناواقف ، اصلیت سے بے خبر ، لغت نگاری کیا خاک کرتا :

''شناسائیِ حقیقتِ جوہر لفظ ندارد فرہنگ چرا می‌نگارد ۔''

یہ اس بے خبری ہی کا نتیجہ ہے کہ 'برہان' نے وہ الفاظ بھی شاملِ لغت کر لیے جو اصلاً فارسی نہ تھے ۔ نہ فارسی میں عام طور سے رائج یا مستعمل تھے کہ انھیں دخیل قرار دے کر شامل کر لیا جاتا ۔ کسی ہندی‌الاصل یا ہندوستان میں قیام کرنے والے فارسی شاعر کے یہاں بار پانے سے کوئی ہندی لفظ فارسی نہیں ہو جاتا ، فارسی میں دخل نہیں پاتا ۔ 'برہان' نے اس قبیل کے بہت سے ہندی الفاظ فارسی‌الاصل سمجھ کر یا دخیل قرار دے کر لغت میں شامل کر لیے ۔ ہندی اور فارسی دونوں میں وہ فرق نہ کر سکے ۔ جھکتڑ ، جمدھر ، گلہری وغیرہ الفاظ سب اسی ذیل میں آتے ہیں ۔

''آنرا خود تفرقہ در ہندی و فارسی نیست ۔ آنکہ جھکڑ و جمدھر و گلہری و مہیشر را در ذیل لغات فارسی و عربی گنجاند اگر پولہ نیز نوشتہ باشد گو بنویس ۔'' (ص ، ۵۰)

(۳)

اندراجِ لفظ ، جیسا کہ میں نے عرض کیا ، لغت نگاری کی اولین منزل اور خاصی اہم اور مشکل منزل ہے ۔ آسانی کے خیال سے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ مفرد الفاظ کا اندراج اور مرکبات کا اندراج ۔ مفرد الفاظ سے متعلق غالب نے ذیل کے اصول بتائے ہیں :

۱۔ زبان کے صرف وہی الفاظ لغت میں جگہ پا سکتے ہیں جو اصلی ہوں یا کسی دوسری زبان سے مستعار لیے گئے ہوں ۔ خاص خاص شعرا یا ادیبوں کے استعمال کردہ اجنبی الفاظ کی لغت میں گنجائش نہیں ۔ زیادہ سے زیادہ انھیں فرہنگوں میں شامل کیا جا سکتا ہے جو ان شاعروں یا ادیبوں کے کلام کی شرح کے سلسلے میں لکھی جائیں ۔ 'جمدھر' وغیرہ الفاظ سب اسی ضمن میں آتے ہیں ۔ یہ خالص ہندی

الفاظ ہیں ۔ عرفی یا طغرا کے یہاں استعمال میں آنے کی وجہ سے انھیں فارسی میں دخیل نہیں کہا جا سکتا ۔

غالب نے 'قاطع' کے آخر میں اس پر بڑی دل چسپ بحث کی ہے ۔ فرماتے ہیں ، کچھ الفاظ فارسی و ہندی میں مشترک ہیں ۔ یہ الفاظ تو بہرحال درجِ لغت ہوں گے لیکن وہ الفاظ جو شعرا نے استعمال کیے ہیں ، فارسی میں عام طور سے استعمال میں نہیں آتے ۔ ان شعرا کی سند پر انھیں دخیل سمجھ کر فارسی لغت میں جگہ دینا مناسب نہ ہوگا ۔ جیسے سوری ، پانی یا انگارہ بمعنی پارۂ آتش وغیرہ ۔

۲- لغت کا تعلق قیاس سے نہیں سماع سے ہے ۔ اس میں سماعی یعنی غیرقیاسی الفاظ اور کلمے درج ہوں گے ۔ مشتقات ، صیغے ، گردانیں لغت میں نہ ہونی چاہئیں ۔ ان کی جگہ قواعد یعنی گرامر ہے ۔

یہ لغت نگاری کا عام مانا ہوا اصول ہے ۔ اس کے مطابق غالب نے لکھا ہے کہ اصل فعل یعنی مصدر درج کرکے اس کے معنی بیان کرنا کافی ہے ۔

''مصدر را نام بردن و معنی آن بنگارش آوردن بس است ۔'' (ص ۲۷)

مشتق کلمے اور ان کے صیغے زبان کے عام قاعدے کے مطابق ڈھلے ہیں ۔ ہر شخص حسب ضرورت یہ صیغے ڈھال سکتا ہے ۔ انھیں لغت میں شامل کرنے کے معنی ہیں مستقل لغت کی حیثیت دینا ، اور یہ لغت نگاری کے اصول اور قیاسِ صحیح کے خلاف ہے ۔

''از مشتقات یک مصدر ہر صیغہ را لغتے مستقل دانستن کدام عقل و شعور است ۔'' (ص ۹۹)

غالب کا خیال ہے کہ کوئی باشعور شخص یہ غلط روش اختیار نہیں کر سکتا :

''مشتقات مصادر مشہورہ را لغت شمردن کار آدمی نیست[۱] ۔'' (ص ۲۰)

'برہان' نے لغت میں جو مشتقات اور صیغے شامل کیے ہیں ، ان میں سے چند کا ذکر غالب نے کیا ہے اور ان کا خاکہ اڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ہرگز اندراج کے قابل نہ تھے ۔ یہ خالص قواعدی مشتقات ہیں ۔

''نیازارم'' کے معنی 'برہان' نے لکھے ہیں : ''آزار ندہم'' ۔ غالب کہتے ہیں ''آزارم'' مصدر آزردن سے مضارع کا صیغہ متکلم ہے ۔ اس پر نون نافیہ بڑھا کر ''نیازارم'' بنا لیا گیا ۔ یہ لغت کہاں ہوا ؟

''از بزار صیغہ یک صیغہ و آن ہم مرکب از نون نفی بدست آوردن

۱- مطلب یہ ہے کہ کسی غیر مشہور مصدر کا مشتق اگر مستعمل ہے تو درجِ لغت کیا جا سکتا ہے ۔

و بعقیدۂ خویش لغتے ضروری دانستن ربط است ، ضبط است ، خبط است چیست ؟'' (ص ۱۴۲)

''نگریزد'' کے ذیل میں غالب نے پھر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ صیغۂ مضارع پر نون نافیہ بڑھانے سے لغت کیوں کر بنا ۔

''نگریزد را کہ مضارعیست جعلی باضافۂ نون نافیہ کہ جزو حقیقی لفظ نیست لغتے مستقل اندیشید ۔'' (ص ۱۱۸)

ایک دوسری جگہ لکھا ہے :

''ہیچ نمی داند کہ صیغۂ مضارع بافزایش نون نافیہ لغت چرا باشد[۱] ۔''
(ص ۱۱۶)

مضارع اور امر کے شروع میں بائے زائدہ کا اضافہ زبان کا عام قاعدہ ہے جو قواعد کی کتابوں میں بیان کر دیا گیا ہے ۔ 'برہان' نے جس طرح مضارع پر نون اضافہ کر کے صیغے بنائے تھے اور انھیں لغت قرار دیا تھا ، اسی طرح 'ب' کے اضافے سے بہت سے لغت بنائے اور کہاں یہ کیا کہ انھیں ایک مرتبہ بائے زائدہ کے بغیر درج لغت کیا ، دوسری مرتبہ بائے زائدہ اضافہ کر کے مستقل طور سے 'ب' کی تقطیع میں شامل کر لیا ۔ اس پر غالب نے اعتراض کیا ہے ۔

''صدرہ آں بینی کہ مصدرے را با برخے از مشتقات جلوہ داد بیفزودن بائے موحدہ زائدہ سر تا سر دگر بارہ نورد از ہم کشاد ۔'' (ص ۳) ۔

''بیاغاریدن'' اور ''بیاغاشت'' کے بارے میں غالب کہتے ہیں کہ یہ لفظ الف ممدودہ میں درج ہو چکے ہیں ۔ بائے زائدہ اضافہ کر کے انھیں ''ب'' کی تقطیع میں کیوں شامل کیا گیا ؟

''بپای'' اور ''بہ بریشد'' کا بھی یہی حال ہے ۔ ''بپای'' پائیدن سے امر کا صیغہ ہے اور بہ پریشد ، بریشیدن کا مضارع ہے ۔ شروع میں ''ب'' کا اضافہ کر دیا گیا ہے ۔ غالب کہتے ہیں کہ ''ب'' صیغۂ امر یا مضارع کا اصلی جز نہیں ۔ صیغۂ جمع کو بھی لغت قرار دینا صحیح نہیں ۔ مفرد اصل لغت ہے جسے زبان کے قاعدے کے مطابق جمع بنایا جا سکتا ہے ۔ صیغۂ جمع کا تعلق قواعد یعنی گرامر سے ہے اور مفرد کا لغت سے ۔ جمع قیاسی ہے ، مفرد سماعی ۔ برہان نے ایک سے زیادہ مقامات پر صیغۂ جمع کو لغت قرار دیا ہے اور اس کے معنی بتائے ہیں ۔

۱- حرف نفی اضافہ کرنے سے نیا لفظ وجود میں نہیں آتا ۔ ''ہرگاہ آب در جگر داشتن بمعنی تمول نوشت صیغۂ مضارع را بافزودن نون نافیہ لغتے دیگر چرا قرار داد ؟''

مثلاً : ''شب رواں ، کنایہ از شب زندہ داراں ۔''

''شب رواں صیغہ آورد و مفرد را نام نبرد ۔'' (ص ۸۳)

عربی جمع البتہ دی جا سکتی ہے لیکن اس کے مفرد کا اندراج بھی ہونا چاہیے ۔ غالب کہتے ہیں کہ ''سلکِ لآلی'' دیا گیا تھا تو ''لؤلؤ'' بمعنی موتی بھی دیا جاتا ۔

(۴)

مرکبات کے اندراج کا سوال زیادہ پیچیدہ ہے ۔ میں اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کروں گا ۔

مرکبات کے باب میں یہ طے ہے کہ صرف وہی مرکبات اندراج کے قابل ہیں جن کی حیثیت مستقل لغت کی سی ہے ۔ جو ترکیب کے بعد گھل مل کر ایک کلمہ بن گئے ہیں اور تنہا ایک معنی ادا کرتے ہیں ، ان کی دو قسمیں ہیں :

(الف) ۔ عام مرکبات جو قواعد کی مدد سے حل نہیں کیے جا سکتے اور کثرت استعمال سے سکہ رائج الوقت بن چکے ہیں ۔ جیسے گوشوارہ ۔

(ب) وہ ترکیبیں جن کی بنیاد کسی استعارے یا کنایے پر ہے ۔ لیکن عام ہونے کی وجہ سے انہیں مستقل لغت کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ان کے کنائی معنی فراموش کر دیے گئے ، جیسے شیر خدا کنایہ ہے حضرت علی[ؑ] مرتضی سے ۔ پہلی قسم کے مرکبات کا لغت میں اندراج اس لیے ضروری ہے کہ وہ قیاسی نہیں سماعی ہیں ۔ لغت میں درج کر کے ان کی شرح نہ کی گئی تو قواعد کی مدد سے انہیں حل نہیں کیا جا سکے گا ۔ دوسری قسم کی ترکیبیں ہر چند قیاسی ہیں لیکن ان کے قواعدی معنی مراد نہیں لیے گئے اور کنائی معنی فراموش کر دیے گئے ۔ ان کا اندراج بھی ضروری ہوا ۔ غالب نے ان کے بارے میں تصریح کی ہے کہ یہ ترکیبیں کسی ایک ادیب کی ملکیت نہیں ، ان پر ہر شخص کی چھاپ ہے ۔ ہزار آدمی ان کو استعمال کر سکتے ہیں ۔

''صد ہزار کس در کلام خویش آوردہ باشند ، سرقہ نیست ۔'' (ص ۱۰۶)

اس سے معلوم ہوا کہ کنائی مرکبات دو طرح کے ہیں : عام بکثرت استعمال ہونے والے مرکبات جن پر سب کا حق ہے ۔ خاص مرکبات یا کنایے جو کسی شاعر یا ادیب کی قوت ابداع کا نتیجہ اور اس کے فکر کی پیداوار ہیں ۔ اس سے پہلے کسی نے انہیں استعمال نہیں کیا اور نہ اس کے بعد وہ عام اور مقبول ہوئے ۔ جیسے زمزم آتشیں ، کعبہ رہ رو ، شیر شرزۂ غاب وغیرہ ، جن کے بارے میں

غالب کہتے ہیں :

''خاقانی بزور قوت ابداع بہم رسانده ۔'' (ص ۱۲)

اس قسم کے کنایات اور استعارے لغت میں درج ہونے نہ چاہئیں ۔ کیوں؟ اس لیے کہ بقول غالب یہ مستقل لغت نہیں اور نہ یہ مشہور کنایے ہیں ۔ ادیب ان سے استفادہ نہیں کر سکتے ۔ ان کا استعمال سرقہ سمجھا جائے گا ۔

''ہر کہ ایں را در گفتار خویش آرد سرقہ خواہد بود ۔ از لغات مستقلہ و کنایہ ہائے مشہورہ نیست کہ بکار دبیران روزگار آید ۔'' (ص ۱۰۶)

'برہان' نے اس قسم کے کنایات اور استعارات بکثرت درج لغت کیے ہیں ۔ عام فقروں اور جملوں کی جگہ بھی لغت میں نہیں ۔ محاورات کی البتہ گنجائش ہے لیکن غالب کے ایرادات سے محسوس ہوتا ہے کہ 'برہان' نے محاورے اور عام جملے میں فرق نہیں کیا ۔ ''دار گوش ، قافلہ شد'' وغیرہ جملے بھی درج لغت کر دیے گئے ۔ غالب کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ لغت نگاری کے اصول نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہوا ۔

''قافلہ شد'' کے معنی 'برہان' نے لکھے ہیں : ''قافلہ رفت'' ۔ غالب کہتے ہیں : ''قافلہ شد لغت چرا قرار یافت ؟''

''دار گوش'' پر بحث کرتے ہوئے غالب نے بڑی دلچسپ بات کہی ہے ۔ فرماتے ہیں :

''ایں دو لفظ را در ذیل لغت آوردن ہم چناں بلکہ ہماں است کہ آب بیار را لغتے قرار دہند ۔'' (ص ۶۸)

''مران'' کو غالب ''مر'' اور ''آن'' سے مرکب بتاتے ہیں جو الگ الگ دو لفظ ہیں ۔ ''مر لفظ جدا گانہ و آن لفظ جدا گانہ ، دو لفظ را یک لغت قرار دادن ۔''

غالب کو کشف اللغات سے شکایت ہے ۔ اس کے مرتّب نے بھی عام فقروں یا غالب کے لفظوں میں کلماتِ مرکبہ کو مستقل لغت سمجھ کر کشف میں شامل کر لیا ہے ۔

''شش ضرب نتیجۂ خوب'' کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ یہ لغت ہے ، نہ اصطلاح ، مرکب جملہ ہے ۔

''یا رب ایں جملۂ مرکب یعنی 'شش ضرب نتیجۂ خوب' لغت است یا مصطلح ۔'' (ص ۸۳)

اس سے معلوم ہوا کہ صرف وہ فقرہ لغت میں درج کیا جاسکتا ہے جو کسی فن یا جماعت کی اصطلاح ہو ۔ مصطلح سے محاورہ بھی مراد ہو سکتا ہے ۔

''فرا مشت'' کے سلسلے میں بھی اس نکتے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔

غالب کے نزدیک یہ بھی ایک فقرہ ہے :

''فرا'' مرادف ''بر'' بمعنی علیا لفظے ست جدا و مشت لفظے است جدا ، چنانکہ بر دست و در دست ۔ ایں لفظ مرکب را لغتے مستقل اندیشید ۔'' (ص ۹۲)

مرکب کے کسی ایک جز کو بھی ، سابق ہو کہ لاحق ، داخلِ لغت کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن غالب کہتے ہیں اندراج صحیح ہونا چاہیے ۔ لفظ کا صرف وہی حصہ درجِ لغت کیا جائے جو اصلی یا بنیادی ہے ۔ ترکیب کے بعد لفظ میں جو تغیر ہوا ، لفظ کے عنصر میں شامل نہ تھا ، اس لیے قابل ترک ہے ، مثلاً ش ، ت ، م فارسی کی متصل ضمیریں ہیں ۔ جب یہ کلمے کے آخر میں اضافہ کی جاتی ہیں تو کلمے کا آخری حرف مفتوح ہو جاتا ہے ۔ جیسے 'راہ' سے 'راہش' ، 'کتاب' سے 'کتابت' وغیرہ ۔ اور اگر آخری حرف ہائے زائد یعنی مخفی ہو تو ایک ہمزہ یعنی الف مفتوح بڑھا دیا جاتا ہے ، جیسے 'نامہ اِش' وغیرہ ۔

'برہان' نے ان ضمائر کا اندراج الف بڑھا کر الف مقصورہ کی تقطیع میں کیا ہے ۔ یہ اصول لغت نگاری کے خلاف ہے ۔ الف ہر مقام پر نہیں ہوتا ۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ، صرف ان کلمات میں ہو گا جن کے آخر میں ہائے مخفی ہو ۔ اس کے علاوہ الف ان ضمیروں کا جز نہیں ۔ زبان کے قاعدے کے مطابق ترکیب کی صورت میں اضافہ ہوا ہے ۔ اس لیے صرف ش ، ت ، م کو لغت بنایا جائے اور وہ حصہ چھوڑ دیا جائے جس کا تعلق قواعد سے ہے ۔ غالب کہتے ہیں :

''در بحث الف با تاے قرشت ''ات'' بفتح ہمزہ ضمیر مخاطب قرار دادہ بود اینک در بحث الف یا شین نقطہ دار''ش'' ''بمعنی ضمیر واحد غائب آورد'' (ص ۳۱)

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے : ''ام یعنی ہمزہ مفتوح و میم را ضمیر متکلم گفت و این خطاے سوم است ۔'' صحیح بات یہ ہے کہ ''ضمیر مخاطب تنہا تاے قرشت است نہ ات ۔''

مند ، گر ، در وغیرہ لاحقے اسم کے آخر میں اضافہ کیے جاتے ہیں ۔ یہ بے قاعدگی ہے کہ ان سے ترکیب پانے والے چند الفاظ مذکور ہوں ، باقی ترک کر دیے جائیں ۔ غالب کہتے ہیں ''دانشور'' اور ''دانش گر'' کا ذکر کیا گیا تھا تو ''دانشمند'' نے کیا قصور کیا تھا کہ اسے ترک کر دیا گیا ۔ مشہور اور غیرمشہور تمام قابل اندراج الفاظ درج ہونے چاہئیں[۱] ۔

۱۔ 'بپوشد' اور 'بپوید' وغیرہ کا ذکر کرکے پوچھتے ہیں کہ یہ کیوں ترک کیے گئے؟ ''گویند ایں الفاظ را بہ سبب شہرت حقیر نشمرد ۔ گوئیم از آسودہ و آشفتہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۵)

اندراج کے بعد ضبط لغت کا درجہ آتا ہے جس کی حسب ذیل تین صورتیں لغت میں رائج ہیں : اعراب بالحرکۃ یعنی لغت درج کر کے اسے مشکّل کرنا اور ہر حرف پر علامات اعراب لگانا ۔ اس میں کتابت کی غلطیوں کا امکان زیادہ ہے ۔ اس کے مقابلے میں اعراب بالحرف ہے ۔ وہ یہ کہ کلمے کے حرف حرف کا نام لے کر بتایا جائے کہ اس پر کون سی حرکت ہے ۔ مفتوح ہے یا مضموم ، ساکن ہے یا متحرک وغیرہ وغیرہ ۔ تیسری صورت ہے کلمے کا وزن بتانا ۔ ہم وزن کلمے کا ذکر کر کے لغت کے تلفظ کی توضیح ۔ اسے اعراب باللفظ کہہ سکتے ہیں ۔

غالب کے نزدیک کلمے کا ضبط اشتباہ کی صورت میں ضروری ہے ، یعنی اُس وقت جب تلفظ واضح نہ ہو اور لفظ کو کئی طرح پڑھا جا سکتا ہو ۔ لفظ ''آرا'' کا ضبط قطعی غیرضروری اور بے مصرف ہے ۔ الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور ماقبل مفتوح :

''آرا لفظے است کہ بغیر اعراب بر روے بزنجیر نتوان بست ۔ در جستجوے ہم وزن کوہ کندن و کاہ آوردن یعنی چہ ؟''

'برہان' نے اس سلسلے میں شترگربگی سے کام لیا ہے ۔ آسان کلمہ پکڑ لیا گیا ، مشکل چھوڑ دیا گیا ۔ غالب اسے ناپسند کرتے ہیں ۔ یہ شیوہ یکسانی کے منافی ہے ۔ ''نوجوان'' کو ضبط نہیں کیا گیا تو غالب نے لکھا : ''نوشتن اعراب و آوردن ہم وزن چرا گذاشت ۔'' اس کے مقابلے میں ''آب چین'' کے لیے آستین کا سہارا لیا گیا تو غالب کو کہنا پڑا : ''بر وزن آستین زاید ، زیرا کہ آب چین را جزیں یک صورت صورتے دیگر در اندیشہ نمی تواند گزشت ۔'' ۔ ''مل تنگ'' کو مہمل چھوڑ دیا گیا ۔ کیوں ؟ کیا اس کا ضبط ضروری نہ تھا ؟

''در مل تنگ توضیح اعراب نہ کرد ۔ کس چہ داند کہ چہ گفت ۔''

لہذا اصول یہ ہوا کہ ہر کلمہ ضبط کے قابل ہے ۔ کلمے کا اعراب (بالحرف یا باللفظ) بہرحال دیا جائے ۔

فارسی میں کلمے کا آخری حرف ساکن ہوا کرتا ہے اور الف لینہ سے پہلے حرف کا فتحہ لازمی ہے اس لیے جہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ الف ساکن

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

آسان تر و مشہور تر نخواہد بود کہ ایں ہر دو مفعول را در بحث الف ممدودہ گنجاند ۔'' (ص ۳۰)

ہے وہاں آخر کلمہ کے سکون کا اظہار بھی عبث ہے ، خصوصیت سے دو حرفی کلمے کے آخری حرف کا سکون جس کا اظہار ضبط سے زیادہ خبط نظر آتا ہے ۔

'برہان' نے ''دائم'' کے ''م'' کو ساکن لکھا تو غالب نے حیرت کا اظہار کیا ۔ ''و لفظ آخر ساکن وا نمودن . . . چیست'' ۔ اسی طرح ''دب'' کی ''ب'' کو ساکن بتایا گیا تو غالب کو استفسار کرنا پڑا :

''اول می پرسم کہ در کلمہ دو حرفی اشارہ بسکون ثانی کدام فائدہ دارد؟''

''مک'' کے بارے میں ارشاد ہوا :

''لفظ دو حرفی را در پارسی آخر متحرک کجا باشد ۔''

دو حرفی کی کیا خصوصیت ہے ۔ آذرم کی ''م'' کو ساکن بتانے پر غالب اپنی ہنسی نہ روک سکے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے :

''بہ تصریح سکون میم کہ حرف آخر است می خندم ۔''

اس بحث سے ایک اصول یہ معلوم ہوا کہ جس حرف، کا اعراب بیّن یعنی واضح ہو ، اس کا ذکر غالب کے نزدیک فعل عبث اور طول لا طائل ہے ۔

اعراب باللفظ کی صورت میں اظہار تلفظ کے لیے ضروری ہے کہ ہم وزن کلمہ اصل لغت سے زیادہ عام ، زیادہ واضح اور زیادہ مشہور ہو کہ تعریف بالمجہول لازم نہ آئے ۔ کسی نامعلوم لفظ کی وضاحت کسی دوسرے نامعلوم لفظ سے لغت اور منطق دونوں میں معیوب سمجھی گئی ہے ۔ اس اصول کو غالب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

''قاعدہ آن است کہ بہر تشخیص اعراب از نظائر آن لفظ می آرند کہ نسبت بلغت آسان تر و مشہور تر باشد ۔'' (ص ۲۰)

اس کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کروں گا ۔

'برہان' نے 'آسودہ' کو 'آلودہ' کا ہم وزن بتایا ہے ۔ غالب پوچھتے ہیں :

''آلودہ را نسبت بہ آسودہ در شہرت و آسانی کدام افزونی است ؟''

''جہان'' کی شرح مکان سے کی گئی تو غالب نے حیرت کا اظہار کیا ۔

''مگر اہل جہان جہان را نمی دانند و مکان را می شناسند ۔''

''اوستاد'' سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے جسے 'برہان' نے ''نوش بار'' کا ہم وزن ظاہر کیا ہے :

''ہمہ دانند اوستاد اسم کیست و بسیارے از یونان ندانند کہ نوش باد چیست ۔''

غالب بنیادی طور پر ادیب اور شاعر ہیں ۔ شاید اس لیے انھیں اس پر اصرار ہے کہ ضبط کے سلسلے میں جو ہم وزن لفظ لکھا جائے وہ بامعنی تو ہوگا ہی ، شائستہ اور مہذب بھی ہونا چاہیے ۔ ''ایثار بخش'' کے لیے ''بیمار نقش'' لغو اور

بے معنی ہے ۔ ''دینار بخش'' بہتر تھا :

''ہم وزن مہمل و لغو ، کاش بجائے بیمار نقش ، دینار بخش یا دیدار بخش می گفت !''

اسی طرح 'کفش' کو 'رخش' کا ہم وزن ٹھہرانا شائستگی کے خلاف ہے ۔

''غالب گوید مگر رخش بر وزن بخش نبود کہ کفش آورد ۔''

(٦)

ضبطِ اعراب کے بعد اصل لغت کی مختلف شکلوں کا سوال سامنے آتا ہے ۔ جدید لغت نگاری کی ترتیب کے مطابق ، جو بڑی حد تک سائنٹفک ہے ، ہونا یہ چاہیے کہ ضبط کے بعد اس سے متصل لفظ کی تمام قدیم و جدید شکلیں درج کر دی جائیں جیسا کہ جدید آکسفورڈ ڈکشنری نے کیا ہے ۔ اردو کے جامع لسانی تاریخی لغت میں بھی آکسفورڈ کے تتبع میں ہر لفظ کے ساتھ ، اس کے تحت ، اس کی مختلف شکلیں درج کی جا رہی ہیں ۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک ہی نظر میں لفظ کی نئی پرانی تمام شکلیں اور صیغے قاری کے سامنے آ جاتے ہیں اور جویائے حقیقت کو لفظ اور اس کی سرشت تک رسائی حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی ۔ یہ الگ بات ہے کہ عام افادے کے لیے لغت کی یہ شکلیں اپنی اپنی جگہ بھی ترتیب تہجی کے اعتبار سے درج لغت ہوں ۔ لیکن یہ طے ہے کہ ان کی بار بار تشریح نہ ہوگی ۔ اصل لغت کے ذیل میں شرح کر دی جائے گی ۔ اس کے بعد جہاں جہاں یہ شکلیں آئیں گی اصل لغت کا حوالہ دینا کافی ہوگا ۔

غالب کی رائے بھی یہی ہے ۔ وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ لفظ کی جتنی شکلیں ہیں سب ایک جگہ اصل لغت کے تحت درج ہوں ۔ انھیں بار بار دہرایا نہ جائے اور نہ بار باران کی شرح کی جائے ۔ فرماتے ہیں :

''ما می گوئیم ہر لغت را باندک تغیر و تبدل لغتے آخر قرار دادن کدام آئین است ۔ مگر در تحت یک لغت ہمہ تغیرات نمی توانست نوشت ؟''
(ص ۲۵)

یہ نہ ہونا چاہیے کہ لفظ کی کسی ایک شکل کے تحت چند معنی دے کر باقی معانی دوسری شکل کے تحت بیان کیے جائیں ۔ لغت نگر کا یہ پھوہڑ پن ہے ۔ ''اروند'' اور ''آروند'' ، ایک لغت کی دو شکلیں ہیں ۔ ایک مقصور ہے ، دوسری ممدود ۔ 'برہان' نے انھیں الگ الگ لکھا ہے ۔ ایک کو الف مقصورہ کی تقطیع میں ۔ دوسری کو الف ممدودہ کی تقطیع میں ۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس لفظ کے تمام معانی کسی ایک شکل پر بحث کرتے ہوئے بیان کر دیے جاتے اور دوسری شکل درج

کرکے پہلی شکل کا حوالہ دے دیا جاتا ۔ اور اگر یہ طریقہ پسند خاطر نہ تھا تو پھر یہی ہو سکتا تھا کہ ہر شکل کے تحت تمام معانی درج ہوں ۔ سب جانتے ہیں کہ اس میں محنت کا زیاں بھی ہے اور وقت کا ضیاع بھی ۔ غالب نے اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے :

''حیرت رو می‌دہد کہ اگر مثلِ آسیغ و اسیغ و آواک و اواک ، اروند و آروند یکیست چرا ہمہ معانی در تحت لغت اروند نیاورد ۔'' (ص ۱۷)

اصول وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ اگر لفظ کا یا اس کی دوسری شکل کا ، افادۂ عام کے لیے اعادہ کیا گیا ہے تو تشریح یا بیان کا اعادہ نہ کیا جائے ۔ اصل لغت کا حوالہ دے دیا جائے اور بتا دیا جائے کہ یہ فلاں لفظ کی بدلی ہوئی تخفیفی ، ایزادی یا تصحیفی شکل ہے ۔ معنی اصل شکل میں بیان کر دیے گئے ہیں ۔

یہ نکتہ غالب نے آرنگ (بمعنی رنج) کے سلسلے میں بیان کیا ہے ۔ فرماتے ہیں : آرنگ بمعنی رنج ، آدرنگ (دال مہملہ سے) یا آذرنگ (ذال معجمہ سے) کی تخفیفی شکل ہے ۔ اس کا اندراج اصل کلمے کے تحت ہونا چاہیے تھا ۔ اور اگر دوبارہ اندراج ضروری تھا تو شرح کرنے کی بجائے صرف یہ لکھ دیا جاتا کہ یہ آدرنگ کی تخفیف ہے ۔

''و بمعنی رنج و محنت ہماں آدرنگ است کہ خود ایں بزرگوار ہم در دال ابجد نوشت و ہم در ذال ثخذ رقم زد ۔ اگر اینجا نیز نوشتن گزیر نداشت بایستے نگاشت کہ مخفف آدرنگ است ۔'' (ص ۱۷)

لغت نگاری کا مقصد لفظ کی معرفت اور شناسائی ہے جو اصول اور ضابطوں کا لحاظ کیے بغیر حاصل نہیں ہوتی ۔ انسان کی طرح لفظوں کے بھی خاندان ہیں ، رشتے ہیں ، میل‌ملاپ اور یگانگی ہے ۔ لفظ رشتوں سے پہچانے جاتے ہیں اور یہ رشتے جبھی معلوم ہو سکتے ہیں کہ ہم اصول کے مطابق ان کا تعارف کرائیں ۔ ہم رشتہ لفظوں کا ایک سلسلے میں ذکر کریں اور حسب ضرورت ایک کے تعلق سے دوسرے کا حوالہ دیں ۔ اس مسئلے کا ذکر شاید اس کی غیرمعمولی اہمیت کے پیش نظر غالب نے بار بار کیا ہے ۔ اور ہر مرتبہ اس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے ۔''آدرم'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ایں لغت را در بحث الف ممدودہ با دال سادہ بشرح و بسط نوشت و باز در فعل ذال منقش آورد ۔'' (ص ۱۵)

ایک دوسرے مقام پر ہے :

''آبشتن گہ و آبشتن گاہ و آبشتگہ و آبشتگاہ را کیست کہ یکے نداند مگر آنکہ در کلاہ و کلہ تفرقہ تواند کرد ۔'' (ص ۱۱)

ایک جگہ لکھا ہے :

"آرفنداک بہ راے قرشت و آزفنداک بہ زاے ہوز و آژفنداک بہ راے فارسی و آفنداک بے راے و زاے تازی و فارسی چہار لغت در چہار فصل بمعنی قوس قزح می نگارد ۔" (ص ۱۹)

لغت نگاری سائنس کا شعبہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ سائنس نام ہے قاعدے کی پابندی کا ۔ بے اصولے پن کی سائنس میں گنجائش نہیں ۔ ہاں بے اصولے پن کو اصول بنا لیا جائے اور غلط روش میں ہمواری ہو تو یہ "وفاداری بشرط استواری" ہوگی ، اسے باقاعدگی کا درجہ دیا جا سکے گا ۔ لیکن 'برہان' نے غلط روش میں بھی ہمواری نہیں دکھائی ۔ کہیں ایک لفظ کے تمام لغات درج کر دیے ، کہیں کچھ درج کیے کچھ چھوڑ دیے ۔ غالب کے خیال میں یہ ناہمواری اصول کے باب میں نااستواری کی دلیل ہے ۔ لغات کے اندراج میں بھی 'برہان' نے کسی اصول کی پابندی نہیں کی[1] ۔

نگاب ، نگاو ، نگاپوے ، نگاور ایک لفظ کی چار شکلیں ہیں ۔ 'برہان' نے 'نگاب' اور 'نگاور' صرف دو شکلیں درج کیں ، باقی غائب کر دیں ۔ کاف عربی سے چاروں شکلیں دی گئی ہیں ۔ اس پر غالب نے تنبیہ کی ہے :

"نکاب و نکاو و نکاپوی و نکاور این چہار لغت نوشت و باز در فصل تاے فوقانی و کاف فارسی نگاب و نگاور را یاد کرد و نگاپوے و نگاو را نام نہ برد ۔۔۔ دو لغت را ازان چہار بکاف فارسی طراز بستن یعنی چہ ؟" (ص ۵۳) ۔

(۷)

لغت نگاری کی آخری منزل تشریح و تفسیر الفاظ ہے جو ہر لحاظ سے دشوار تر منزل ہے ۔ اس سے بہت کم لوگ اپنا سامان سلامت لے جا سکے ہیں ۔ لغت کو اچھی طرح سمجھ کر جامع ، واضح ، مناسب اور مختصر الفاظ میں اس کی تشریح آسان نہیں ۔ لفظ کی تشریح کا لغت میں وہی مقام ہے جو منطق میں حد یعنی تعریف کا ہے ۔ تعریف جامع بھی ہوتی ہے اور مانع بھی ۔ جن چیزوں پر لفظ کا اطلاق ہوتا ہے وہ تعریف میں شامل ہوتی ہیں ، یہ تعریف کی جامعیت ہے ۔ جو چیزیں خارج ہیں وہ تعریف میں شامل ہونے نہیں پاتیں ، بدستور خارج رہتی ہیں ۔ یہ

۱- ہر لفظ بہ اندک تبدل و تغیر لغتے دیگر و ہر لغت را بیانے دیگر ۔" (درفش ، ص ۳)

مانعیت ہے -

غالب نے تشریح سے متعلق بھی کچھ اصول بتائے ہیں اور ان کی اہمیت کے پیش نظر ان کا بار بار ذکر کیا ہے - چند درج ذیل ہیں :

۱ - تشریح میں اختصار سے کام لے کر کم سے کم لفظوں میں مفہوم ادا کیا جائے ، کوئی غیر ضروری لفظ نہ ہو -

برہان نے ''آرا'' کے معنی لکھے ہیں ''آرایش کن و بیارا'' - غالب کہتے ہیں ''آرایش کن'' کے بعد ''بیارا'' غیر ضروری ہے : ''مگر آرایش کن بس نبود کہ بہاں آرا را بافزودنِ بائے موحدہ زائدہ باز آورد ؟''

''تر دامن'' کی تشریح 'برہان' نے نو ہم معنی الفاظ سے کی ہے - غالب کے نزدیک یہ تطویل بے جا ہے - ''مگر یکے ازیں نُہ معنی بس نبود ؟''

''کشاورز'' کو تین ہم معنی الفاظ برزی گر ، دہقان ، زراعت کنندہ سے واضح کیا گیا ہے - غالب اسے تمسخر قرار دے کر پوچھتے ہیں : ''مگر یک لفظ ازیں سہ لفظ کفایت نمی کرد ؟'' - ''دژم'' کی شرح میں تیرہ الفاظ لکھے گئے ہیں جن میں کے ہر دو لفظ مترادف ہیں -

(۲) تشریح میں اس لفظ کا اعادہ نہ کیا جائے جس کی تشریح کی جا رہی ہے - منطقی لحاظ سے یہ تعریف المجہول بالمجہول ہے -

''آرا'' کے 'برہان' نے معنی بتائے ہیں ''بیارا'' - غالب کہتے ہیں : ''آرا لغت و بیارا معنی مگر ایں تقریر لایعنی معنی دارد ؟''

'برہان' نے قریب قریب ہر جگہ صیغۂ امر کے معنی میں بائے زائدہ اضافہ کر کے امر لکھا ہے - غالب نے بار بار اس پر گرفت کی ہے اور بجا گرفت کی ہے - ''بیاسا ، ایں خود بہاں آسا است کہ بائے زائدہ را در اول آں افزودہ اند - ایں ایراد را پیش ازیں در چند جا باز نمودہ ام -''

بائے زائدہ اضافہ کرنے سے لفظ بدل نہیں جاتا - ''مگر رو دیگرست و برو دیگر ؟''

''قافلہ شد'' کے معنی ''قافلہ رفت'' بتائے گئے ہیں - غالب کہتے ہیں کہ یہ ہزل اور خبط ہے -

نبشتن کے معنی 'برہان' نے نوشتن لکھے ہیں - غالب اسے تشریح نہیں بتاتے اور یہ حقیقت ہے کہ ''نوشتن'' نبشتن ہی کی ایک شکل ہے - اس لیے قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ لکھنے کی بجائے کہ ''نبشتن'' کے معنی ہیں نوشتن ، یوں کہنا چاہیے کہ ''نبشتن بدل نوشتن است'' -

اسی طرح ''فولاد'' کی تشریح پولاد سے کرنا بھی صحیح نہیں - فولاد اور

پولاد دونوں ایک ہیں ۔ بقول غالب ''فولاد'' مبدل منہ ہے ''پولاد'' کا ۔

۳ ۔ تشریح واضح ، غیرمبہم اور ''نا سزا بیانی'' سے پاک ہونی چاہیے کہ قاری کو سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے ۔

''باد بران'' کے معنی 'برہان' نے لکھے ہیں : ''شخصے باشد کہ پیوستہ از خود گوید ۔'' غالب کہتے ہیں : ''پیوستہ از خود گوید'' غیر واضح ہے : ''بعد از تامل بسیار چناں در دل فرود آید کہ از خود گفتن لاف و گزاف و خود نمائی و خود ستائی باشد ۔''

اسی طرح ''دژم'' کی تشریح میں ''فرو افگندہ'' مبہم لفظ استعمال ہوا ہے ۔ غالب تعجب سے پوچھتے ہیں ''فرو افگندہ یعنی چہ ؟''

۴۔ تشریحی الفاظ بر محل ، مناسب اور قطعی الدلالت ہوں ۔

''دچار'' کے معنے لکھے ہیں : ''ملاقات کردن دو شخص باشد با یک دیگر بیک نگاہ'' ۔ اول تو تنہا ''دچار'' کے یہ معنی نہیں ، ''دچار شدن'' کے ہیں ، دوسرے ''بیک نگاہ'' زائد ہے ۔ دوچار ہونے کے سیدھے سادے معنی ہیں ملاقات کرنا ۔

'جمدھر' کو 'برہان' کٹار بتاتے ہیں حالانکہ ''کٹار حربہ' دیگر است و جمدھر حربہ' دیگر ۔''

''بسمل'' کے معنی 'برہان' کے نزدیک ہیں ''ہر چیز کہ آن را ذبح کردہ باشند یعنی سر بریدہ باشند ۔'' غالب کہتے ہیں 'چیز' بے محل ہے ۔ ''ذبح برائے جانداران است نہ از بہر اشیا'' ۔ سر بریدہ نامناسب بھی ہے اور غیر قطعی بھی ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ ''ذبح عبارت از گلو بریدن است سر بریدن چہ معنی دارد ۔''

'میاں' کے معنی بزرگ نہیں ، یہ تعظیم کا لفظ بھی ہے اور لطف و شفقت کا بھی ۔ 'برہان' میں ہے : ''مدہوش در عربی صاحبِ دہشت باشد ۔'' غالب کہتے ہیں : ''مفعول دہشت را صاحبِ دہشت گفتن نیز نسبتے است بعید ۔'' یہ لکھنا چاہیے تھا کہ ''مدہوش'' دہشت کا مفعول ہے ۔

''راہ خفتہ'' نامانوس اجنبی راستہ جس پر آر جار نہ ہو ۔ 'برہان' کہتے ہیں : دور دراز اور ہموار راستہ ۔ غالب کو اس پر اعتراض ہے کہ دور دراز کا ہموار سے تعلق ؟ کیا ہموار دور دراز کا مرادف ہے ؟ ''ہموار با دور دراز چرا مرادف باشد''۔ ''دستبو'' کو 'برہان' خربزے سے ملتی جلتی نبات بتاتے ہیں ۔ غالب دریافت فرماتے ہیں : ''خربزہ نبات است یا ثمر ؟'' اس کے علاوہ 'برہان' نے اس 'نبات' کو گرد اور کوچک بتایا تھا ۔ غالب حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ کون سی نبات ہے جو چھوٹی بھی ہے اور گول بھی ۔

''دہان درہ'' کو 'برہان' نے خمیازہ بتایا ہے ؛ حالانکہ دونوں میں فرق ہے ؛ 'خمیازہ' انگڑائی ہے اور 'دہان درہ' جمائی ۔

قریب قریب یہی حال ''ایدام'' کا ہے جس کے معنی 'برہان' نے بتانے ہیں جسم اور اسے جوہر کا مقابل قرار دیا ہے ۔ غالب کا فرمانا سو فی صد بجا ہے کہ جسم کا مقابل جوہر نہیں روح ہے : ''جوہر مقابل جسم چگونہ تواند بود؟ آرے تقابل جسم با روحست و تقابل عرض با جوہر ۔''

۵- جامع ہونے کے ساتھ ساتھ تشریح کا حاوی اور لغت سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ۔ حاوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کے جملہ معانی اور ان کے تمام پہلو بیان کیے جائیں اور ہم آہنگ ہونے کا مطلب ہے لفظ و معانی کی مطابقت ، یعنی اسم کی تشریح اسم سے ، فعل کی فعل سے ، مفرد کی مفرد سے اور جمع کی جمع سے ۔

''دوچار'' کے معنی 'ملاقات کردن' اس لیے درست نہیں کہ 'دوچار' اسم ہے اور 'ملاقات کردن' فعل ۔ 'ملاقات کردن' کے معنی ہیں 'دوچار شدن' ۔

''جوہر'' کے 'برہان' نے متعدد معنی لکھے ہیں ؛ منطق میں جوہر ، عرض کا مقابل ہے ۔ یہ معنی بھی درج لغت ہونے چاہئیں تھے ۔ غالب کہتے ہیں : ''ہر آئینہ می توان دانست کہ نمی دانست'' ۔

''شبروان'' جمع ہے شب رو کی لیکن 'برہان' نے اس کی تشریح میں عسس اور دزد وغیرہ مفرد الفاظ استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے : ''کنایہ از عسس و دزد و عیار ہم ہست'' ۔ اس پر غالب معترض ہیں : ''صیغۂ جمع بر مفرد چگونہ تواند آمد ؟ کاش چنانکہ شب زندہ داران و سالکان نوشتہ بود ، ایں جا نیز عسسان و دزدان و عیاران می نوشت ۔''

اس کے برعکس ''جہ'' اور ''جیبر'' مفرد ہیں ۔ برہان نے اول الذکر کے معنی زنان فاحشہ لکھے ہیں اور ثانی الذکر کے معنی فرادیس بتائے ہیں جو جمع ہے فردوس کی ۔ غالب دریافت کرتے ہیں کہ ''جہ'' جمع ہے تو اس کا مفرد کیا ہے؟ اسی طرح 'جیبر' کا مفرد بھی بتایا جائے ۔ مطلب یہ کہ یہ لغات یقینی طور سے مفرد ہیں ۔ ان کی شرح میں جمع کے صیغے درج کرنے سے فائدہ ؟

۶- اس سلسلے کا اہم اصول جس کی طرف غالب نے توجہ دلائی ہے ، یہ ہے کہ لفظ کی تشریح اس کے جوہر یعنی حقیقت کے پیش نظر ہونی چاہیے اور لفظ کے ماخذ اور اس کی بناوٹ کو دیکھ کر اس کے معنی متعین کرنے چاہئیں ۔ سب جانتے ہیں کہ محاورے میں لفظ کے حقیقی معنی باقی نہیں رہتے ۔ اکثر محاورہ اسم و فعل سے ترکیب پا کر بالکل نئے اور اپنے اصلی معنوں سے مختلف معنوں میں بولا یا برتا

جاتا ہے - جیسے گل شدن بمعنی ظاہر ہونا ، تن زدن بمعنی خاموش ہونا - یہ بڑی نادانی ہوگی اگر ہم ان محاوروں کے یہ معانی دیکھ کر گل کے معنی ظاہر اور تن کے معنی خاموش بتائیں - لیکن حیرت ہے کہ برہان جیسے فاضل اجل نے تن کے معنی خاموش لکھے اور ثبوت میں تن زدن کو پیش کیا ہے - ''و بمعنی خاموش ہم ہست چہ تن زدن خاموش شدن را گویند'' - اس پر غالب فرماتے ہیں :

''سخن درین است کہ تن را بمعنی خاموش می گوید و تن زدن را مفید مدعاے خویش می داند و نمی داند کہ تن زدن اصطلاحے است بمعنی خموشیدن ، چنانکہ گل کردن بمعنی ظاہر شدن - تنہا تن بمعنی خموش و تنہا گل بمعنی پدیدار کجا است -''

''شبدیز'' کے 'دیز' کی بھی یہی کیفیت ہے - 'شبدیز' کے معنی ہیں سیاہ رنگ - 'برہان' ترکیبی معنوں سے دھوکا کھا کر 'دیز' کے معنی رنگ تجویز فرماتے ہیں اور اس پر غور نہیں کرتے کہ 'دیز' جیسا کہ غالب نے لکھا ہے 'دیس' کی بدلی ہوئی شکل ہے - اس کے معنی ہیں مثل و مانند :

''سخن این است کہ دیس بدال مکسور و یاے مجہول لغتے است فارسی بمعنی مثل و مانند و ''دیز'' بدل آں ، چون ایاز و ایاس - لاجرم معنی شبدیز مانا بہ شب است -''

آقاے پور داؤد اسے Daesa سے ماخوذ بتاتے ہیں جس کے معنی ہیں نشان[1] امر اور اسم کی ترکیب سے حالیہ نا تمام یعنی اسم فاعل کے معنی پیدا ہوتے ہیں - یہ زبان کا عام قاعدہ ہے - برہان کی سادگی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ امر اسم فاعل کے معنوں میں بولا جاتا ہے - چنانچہ جہاں انہوں نے امر کا صیغہ لکھ کر اس کے معنی بتائے ، وہاں فاعل کے معنی بھی لکھ دیے - میں صرف چند مقامات کی نشان دہی کروں گا :

''آفرین بر وزن آتشین بمعنی تحسین و ستایش و دعائے نیک باشد و بمعنی آفریننده متداولست'' - ''آمای'' 'پر کننده و آراینده'' - ''آسا ، آساینده را نیز گویند - ''افشار'' بمعنی ممد و معاون ہمچو دزد افشار - ''پیرا'' بمعنی پیراینده'' - وغیرہ وغیرہ -

غالب نے ہر جگہ گرفت کی ہے اور واضح طور سے بتایا ہے کہ تنہا امر سے اسم فاعل کے معنی سمجھ میں نہیں آتے - اسم کے ساتھ ترکیب پانے کے بعد اسم

۱- قدیم فارسی Daesa اور سنسکرت 'درش' ایک مادے سے ہیں - اصلی معنی ہیں دیکھنا - اردو ''دسنا'' (نظر آنا) بھی اسی سے ہے -

اور امر مل کر اسم فاعل کے معنی ادا کرتے ہیں ۔

۱۔ ''آفرین'' لغتے دیگر است از مشتقات آفریدن بمعنی امر و صیغۂ امر بے آنکہ اسم در اول او در آرند ہرگز افادۂ معنی فاعلیت نمی کند ۔''

۲۔ ''آمای'' امر جنانکہ نظامی فرماید : توئی گوہر آمای چار آخشیج ۔ تا لفظ گوہر پیش از لفظ آمای نیامدہ است صیغہ امر معنی فاعل ندادہ است ۔

۳۔ ''تنہا صیغہ امر افادۂ معنی فاعلیت کجا می‌کند کہ بمعنی آمایندہ نیز آورد ۔''

۴۔ ''پیرا'' بمعنی پیرایندہ چگونہ تواند بود ، تا اسمے در اول نیارند معنی فاعل ندہد ۔''

برہان کی اس عام فروگذاشت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ برہان کی عادت ہے کہ قریب قریب ہر مقام پر امر کا صیغہ لکھتے اور امر کے ساتھ ساتھ مصدر اور فاعل کے معنی بھی بتاتے ہیں ۔ میں کہاں تک دہراؤں :

''صیغۂ امر را بمعنی مصدر و فاعل آوردن و پایان کار بسوے معنی امر ایما کردن سکہ اوست ۔ آں را تا کجا گویم ۔''

آخر میں چند اہم بنیادی چیزوں کا ذکر کروں گا جن کی طرف غالب نے توجہ دلائی ہے اور لغت نگاری کے سلسلے میں ان کی اہمیت کا صراحۃً یا کنایۃً اعتراف کیا ہے ۔ غالب نے 'قاطع' کے مقدمے میں اس کا ذکر کیا ہے کہ جامع لغات کی نظر جوہرِ لفظ پر ہونی چاہیے ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ جوہرِ لفظ سے غالب کی مراد لفظ کی اصل ، اس کی بناوٹ اور اس کا ماخذ ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک لفظ کی اصلیت اور اس کی بناوٹ کا علم نہ ہو ، یعنی یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا ماخذ کیا ہے ، اس کے کیا معنی ہیں اور کس طرح لفظ وضع ہوا ؟ اس وقت تک اس کے معنی نہیں بتائے جا سکتے ۔ اور ان چیزوں کا علم قواعد ، لسانیات اور اس کے ایک خاص شعبہ اشتقاقیات کے گہرے مطالعے کے بعد حاصل ہوتا ہے اس لیے میں نے تمہیدی سطور میں عرض کیا تھا کہ لغت نگاری کا تعلق ادب اور سائنس دونوں سے ہے ۔ ادب سے کم اور سائنس سے زیادہ ۔

غالب کا ذہن تنقیدی تھا[1] ۔ اگرچہ انھوں نے لغت اور لسانیات کا باقاعدہ

۱۔ غالب نے اسے سلامت طبع سے تعبیر کیا ہے اور تصریح کی ہے :
''کہ غلط را نمی پذیرد و جز براستی آرام نمی گیرد ۔'' (ص ۱۳۱)

مطالعہ نہیں کیا تھا (اور جب یہ فن باقاعدہ مرتّب ہی نہ تھا تو اس کا باقاعدہ مطالعہ وہ کیا کرتے) لیکن انھوں نے تنقیدی ذہن سے کام لے کر نہ صرف یہ کہ لغت کے اصول دریافت کیے ، ان کا اطلاق بھی کیا ۔ ان کی روشنی میں برہان کی لغت نگری کی کمزوریاں یا خامیاں دکھائیں جو اہل علم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ۔ اوپر کی سطروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غالب کی نظر کتنی وسیع تھی ۔ کس حد تک وہ لفظوں کو جاننے اور ان کی اصلیت کو پہچانتے تھے اور کہاں تک قلب ، تخفیف ، تصحیف وغیرہ لفظی تبدیلیوں سے باخبر تھے ۔

'اورند' بر وزن 'سوگند' پر بحث کرتے ہوئے غالب نے 'برہان' کی پریشان بیانی کی شکایت کی ہے اور لکھا ہے کہ اس لفظ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ 'ارونđ' کا مقلوب ہے ۔ 'الوند' اس کی ایک شکل ہے ۔ 'ر' لام سے بدل گئی ۔ بطور استعارہ شان و شکوہ اور عظمت و وقار اس کے معنی لیے جاتے ہیں اور بس ۔

غالب نے جگہ جگہ ''حقیقت جوہر لفظ'' سے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے ۔ ''دیز'' کا ذکر کر چکا ہوں اور اس کی تائید میں ایران جدید کے ماہر السنہ پور داؤد کا قول اور ان کی تحقیق پیش کر چکا ہوں ۔ ایک دو مثالیں اور عرض کرتا چلوں ۔

''جم‌دھر'' کی اصل 'برہان' کے نزدیک 'جنب در' بمعنی پہلو شگاف ہے ۔ اور ہندی میں جم دھر کے معنی ہیں دندان عزرائیل ۔

غالب کہتے ہیں یہ لفظ فارسی نہیں ہندی ہے ۔ جنب (= پہلو) در (دریدن = پھاڑنا) صحیح نہیں یہ گنگا جمنی ترکیب ہے ۔ 'جنب' عربی ہے اور 'در' فارسی ۔ یہ صحیح ہے کہ سنسکرت (مراد پراکرت) میں 'جم' موت کا دیوتا ہے (سنسکرت میں 'یم' ہے) لیکن ''دھر'' امر ہے دھرنا سے غالب کا قیاس درست ہے ۔ ''جم دھر'' کے معنی ہیں وہ آلہ جس سے یم دیوتا رشتۂ حیات منقطع کرتا ہے ۔

(۹)

اور بھی بہت سے لسانی نکات قاطع میں ہیں جن کی تفصیل شاید موجب تطویل ہو ۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ کے صحیح صحیح معنی متعین کرنے کے لیے اسناد و شواہد درکار ہیں ۔ غالب نے الفاظ کے بعض معانی سے انکار کیا ہے اور ان کے لیے سند طلب کی ہے ۔ لیکن معروف معنی کے لیے وہ سند کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے ۔ اصول یہ ہے کہ غریب الفاظ اور غیرمعروف معانی قابل تسلیم نہیں ، جب تک سند نہ ہو ۔ لغت کا مدار قیاس پر نہیں ، اساتذہ کے استعمال پر ہے ۔ آرنگ کے

بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے معنی رنج ہیں ۔ اس کے لیے سند چاہیے ، بے سند کیسے مانوں : ''اما بے سند باور نتوان داشت'' (ص ۷۱) 'آبگیر' کے تحت ارشاد ہوا ہے :

''ازانجا کہ قیاس در لغت پیش نمی رود تا سند نیارند معقول نمی شود''

''آستینہ'' بمعنی تخم مرغ کے بارے میں لکھتے ہیں : (ص ۱۲)

''ایں چنیں لغت غریب را چگونہ بے سند باور داریم ۔'' (ص ۲۰)

شاذ اور نادر لغات کے باب میں تنہا ایک سند پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔ ''آواز گشتن'' کے ذیل میں فرماتے ہیں : ''فخر گورگانی کی سند نادر اور مسنک جمہور کے خلاف ہے ۔ اسے کس قاعدے سے تسلیم کیا جائے ۔

''کلامے کہ ہمیں در یک جا مذکور باشد و آں نیز خلاف عقیدہ جمہور ، پذیرفتن آں از روے کدام دستور باشد ؟''

ترتیب لغات کا مسئلہ بھی خاصا اہم ہے ۔ یہ خیال کرنا درست نہیں کہ غالب ترتیب تہجی کے خلاف ہیں اور اس کے روادار نہیں کہ لغات ترتیب تہجی سے درج کیے جائیں ۔ غالب جانتے ہیں کہ لغات کی ترتیب کا صرف یہی ایک طریقہ ہے ۔ ترتیب تہجی کی بنا پر ہی لغات کو آگے پیچھے رکھا جا سکتا ہے ۔ البتہ وہ اس کے خلاف ہیں کہ قواعدی مشتقات جن کی جگہ لغت نہیں قواعد ہے ، لغت میں درج کیے جائیں اور ان میں بھی ترتیب تہجی کا لحاظ رکھا جائے ۔ مشتقات کا اندراج اگر ایسا ہی ضروری ہے تو مستقل لغات قرار دے کر مختلف ابواب میں درج کرنے کی جگہ انھیں مصدر کے تحت درج کیا جا سکتا ہے ، جیسا کہ قواعد میں ہوتا ہے ۔ یہ طریقہ قیاس و صواب سے زیادہ قریب ہے ۔ لسان العرب وغیرہ عربی لغات میں اسی پر عمل کیا گیا ہے ۔ انگریزی فرہنگوں کی روش بھی یہی ہے ۔

غالب نے اندراج و استخراج میں فرق کیا ہے ۔ مشتقات کا لغت میں اندراج نہیں استخراج ہوتا ہے ، جس کا تقاضا ہے کہ مشتقات سب مصدر کے تحت درج ہوں ۔ معنی صرف مصدر کے بتائے جائیں ۔ 'برہان' نے غالباً لغات کی تعداد بڑھانے کے لیے استخراج کو نظر انداز کیا ۔

''افزودن شمارۂ لغات بہر صورت پیش نہاد ہمت والاے اوست نہ دران روش از برہم خوردن قاعدہ استخراج پروا دارد ۔''

مشتقات مستقل لغت نہیں کہ ترتیب تہجی یعنی حرف سوم و چہارم کی رعایت سے لغت میں جگہ پائیں ۔ مصدر سے متفرع ہونے کے باعث مصدر کے تابع ہیں اس لیے غالب کہتے ہیں مشتقات اور صرف مشتقات میں (دوسرے الفاظ میں نہیں) حرف سویں و چہارمیں کی رعایت لزوم ما لا یلزم ہے ۔

''تقدیم مصدر بر مشتقات لازم بل الزم ۔'' (ص ۳۵)

بقیہ الفاظ و لغات میں بدستور ترتیب تہجی کی رعایت ہوگی ۔ اندراج لفظ کے سلسلے میں غالب کا یہ قول درج کیا جا چکا ہے :

''مشتقات را برعایت لفظ سوم و چہارم سلسلہ در سلسلہ و قافلہ در قافلہ

تا کجا می دواند ۔'' (ص ۹۳)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشتقات کے باب میں غالب نہیں چاہتے کہ ترتیبِ تہجی کا لحاظ کر کے انہیں ان کے ماخذ یعنی مصدر سے دور پھینکا جائے ۔ ہزار داستان کے تحت اس کو صاف کر دیا ہے کہ اصل لغات ترتیب تہجی سے درج ہوں گے ۔ فرماتے ہیں :

''در تقدیم و تاخیر حروف تہجی غلط نمی رود لغت گو غلط باش ۔'' (ص ۱۲۶)

آخر میں لغات کے املا کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دیا جائے تو بیجا نہ ہو گا ۔ لغت نگاری کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت ہے ۔ کبھی کبھی غلط املا کی وجہ سے لفظ کی شخصیت پر پردہ پڑ جاتا ہے اور خاصا جانا پہچانا لفظ کچھ انجان سا نظر آتا ہے ۔ مثلاً ''آخور خشک'' کے مقلوب ''خشک آخور'' کو برہان نے ملا کر ''خشکا خور'' لکھا اور جیستان بنا دیا ۔ خشک اور آخور جدا جدا دو لفظ ہیں ، انہیں ملا کر لکھنا درست نہ تھا ۔

''ہرآئینہ نباید کہ متصل و باہم نوشتہ آید ۔'' (ص ۶۵)

''تھوڑا'' ہندی لفظ ہے ۔ برہان نے ''ہ'' سے ''تھورہ'' قلم بند کیا ہے ۔ غالب کہتے ہیں : ''ادخال ہائے ہوز بجائے الف نمی بایست ۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہندی الاصل الفاظ کے آخر میں جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو ، ہائے ہوز کی جگہ الف لکھنا چاہیے ۔

ایک اور دلچسپ مثال ہے ''سپیدیو'' جو اصلاً ''سپید دیو'' تھا ۔ دال ترخیم کی نذر ہو گئی ۔ برہان ''سپی دیو'' لکھ کر فرماتے ہیں : سپی بمعنی سپید باشد'' ۔ ''سپی'' تنہا کوئی لفظ نہیں ، ''سپیدیو'' ہے ۔ ''سپیدیو'' را منفصل نوشتن نا آگہی است ۔''

غالب نے قاطع میں اور بھی بہت سی دلچسپ اور فکر انگیز بحثیں کی ہیں ۔ عجیب و غریب ادبی نکات اور لغوی لطائف بیان کیے ہیں ۔ میں نے اس فرصت میں صرف اصول سامنے رکھے ہیں ، فروع نظر انداز کر دیے ہیں ۔ اصول کی تشریح و توضیح میں بھی چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے ۔ استیعاب اور استقصا سے کام لیا جاتا تو ایک مستقل رسالہ بن سکتا تھا جس کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے نہ طاقت ۔ ان چند سطروں سے غالب کے کام کی اہمیت ، فکر کی گہرائی اور ذہن کی رسائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اہل علم غالب کے کہنے کے مطابق ''چشم غلط بیں'' سے کام نہ لیں :

''در نگرستن ایں نامہ کہ من سیہ کردہ ام شرط آنست کہ چوں بدیدن ایں سواد سویدا مدار دل نہند ، برہان قاطع در مقابل نہند ، چشمے بسوے آں دارند و چشمے بسوئے ایں ۔ اما چشمِ حقیقت نگر نہ چشمِ غلط بیں ۔'' (ص ۴)

یوسف جمال انصاری

کلام غالب میں طنز و ظرافت

(آخری قسط)

اس قسم کے لطیف مطالب غالب کے اشعار میں اس طرح چھپے ہوئے ہیں جیسے آئینے میں جوہر۔ ظاہر بیں ناقدین یہ گمان کر سکتے ہیں کہ میرزا نے ترکِ شراب کا بیڑا اٹھایا ہوگا لیکن ڈرتے جاتے ہوں گے کہ کہیں آگے چل کر شیطان کے بہکانے میں نہ آ جائیں۔ لیکن غالب کے معتقدات، ان کی آزادہ روی، ان کی رندی و سرمستی جن لوگوں پر عیاں ہو، انھیں اس شعر کی تہہ میں وہ مطلب نظر آئے گا جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہاں غالب اپنے دعویٔ پارسائی پر طنز کر رہے ہیں۔ طنز غالب کی فطرت میں داخل تھی۔ عمر بھر وہ دوسروں پر اور خود اپنی ذات پر طنز کرتے رہے۔ لطیف طنز کا نمونہ مندرجہ بالا شعر ہے لیکن زہرناک طنز کے بے شمار نمونے خطوط اور اشعار میں پھیلے ہوئے ہیں۔

غالب اپنے دور میں آزادہ روی کے سبب سے بھی مشہور تھے۔ اسلامی حکومت کے زمانے میں ایسی مثالیں خال خال ہی سننے میں آتی ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذاتی کمزوری کو اس طرح ہوا دے جیسے میرزا غالب نے اپنی شراب نوشی کو دی۔ عام طور پر اس قسم کی کمزوریوں کو چھپانا مرجح سمجھا جاتا تھا۔ اردو غزل کی روایت کچھ اس قسم کی ہے کہ شراب کا تذکرہ منجملۂ مضامینِ غزل رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ جن شعرا نے مضامینِ غزل میں سے شراب کا مضمون اپنے اشعار میں باندھا ہے، وہ شراب نوشی میں مبتلا بھی رہے ہوں۔ اس لیے کسی شاعر کی زندگی پر قلم اٹھاتے وقت نقادوں نے اس بات کی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی ہے کہ شاعر کی مے نوشی حقیقی ہے یا محض خیالی۔ ایسی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں کہ بعض شعرا نے رندی و مے نوشی کے مضامین باندھنے میں شہرت حاصل کی ہے، لیکن سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے کہ ان کو شراب سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ دور جانے کی کیا ضرورت

ہے ، ہمارے سامنے ریاض خیر آبادی کی شاعری موجود ہے ۔ ریاض کی شاعری میں خمریاتی رنگ کی وہ فراوانی ہے کہ یہ گمان ہو سکتا ہے کہ مضامینِ شراب انھوں نے محض رسمی طور پر نہ باندھے ہوں اور شراب کے ساتھ ان کا واقعی کوئی تعلق رہا ہو ، اس لیے کہ بیشتر شعرا شراب کو اس قدر زیادہ اہمیت نہیں دیتے ۔ جہاں اور موضوعات شعر ہیں وہیں ایک شراب بھی ہے ۔ تحقیق کا خیال ایسی صورت میں آتا ہے جیسی ریاض کی شاعری میں پیش آئی ہیں ۔ اس لیے ریاض کی زندگی پر قلم اٹھانے والوں کو تحقیق کرنی پڑی اور یہ نظریہ ہمارے سامنے آیا کہ ریاض شراب نہیں پیتے تھے ۔ پھر بھی ہمارے زمانے میں بعض شعرا علانیہ شراب نوشی کرتے رہے ہیں اور فخریہ اپنی زندگی کے اس پہلو سے عوام کو روشناس بھی کراتے رہے ہیں ۔ غالب کے زمانے تک معاشرے میں جس قسم کی اقدار رائج تھیں ، ان کے پیش نظر شراب نوشی پر فخر کرنا ایک غیر مستحسن فعل سمجھا جاتا تھا ۔ غالب کھلم کھلا اور فخریہ اس کا اعلان کرتے تھے ۔ ہم اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ملامت کا ایک انداز ہے :

دل پھر طوافِ کوے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ دار و گیر برپا ہوا تو غالب بھی انگریز حاکموں کے سامنے لائے گئے ۔ ان پر شاہِ دہلی کی ہواخواہی کا الزام تھا ۔ اس الزام میں متعدد اربابِ کمال پھانسی کے تختے پر چڑھائے جا چکے تھے ۔ غالب نے اپنی وکالت اس موقع پر ان الفاظ میں کی کہ آدھا مسلمان ہوں ۔ شراب پیتا ہوں ، سؤر نہیں کھاتا ۔ بظاہر غالب کے اس دعوے سے ہوئے تضحیک آتی ہے جیسے وہ اپنے مسلمان ہونے کی تردید کر رہے ہوں ۔ لیکن حقیقتاً وہ اپنے آپ پر طنز کر رہے ہیں ۔ تضحیک اپنی ذات کی مراد ہے ، نہ کہ مسلمان ہونے کی ۔ طنز نگار کا کام یہ ہے کہ اپنے کو اپنی ذات سے الگ کر سکے اور اپنے اوپر بھی اسی معروضی انداز سے ہنس سکے جس سے وہ دوسروں پر ہنستا ہے ۔ غالب میں ہم کو یہ خصوصیت نظر آتی ہے اسی لیے ان کی طنز کا وار اتنا بھرپور ہوتا ہے ۔ جو اپنی ہنسی اڑانے سے بھی نہ چوکے وہ بھلا کس کو بخشے گا ۔ اس ضمن میں اگرچہ بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن غالب کا ایک خط خاص اہمیت کا حامل ہے : ''آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں ۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں ۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے ۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک جوتی اور لگی . . . آئیے نجم الدولہ بہادر ! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے ۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں : اجی حضرت نواب صاحب ! کہیے

یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے . . . بولے کیا بے حیا ، بے غیرت ۔ کونھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض[1] لیے جاتا ہے ۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا[2]" اس قسم کے طنز کو ڈرامائی طنز کہنا چاہیے ۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے ۔ گویا شخصیت کی اِکائی ٹوٹ گئی ہو ۔ ایک غالب ہے کہ دوسرے غالب پر طنز کے تیر چلا رہا ہے ۔ کچوکے پر کچوکا لگائے جا رہا ہے ۔ جب ذہنی کیفیت بدلتی ہے تو غالب اپنے پر رحم کھاتے ہیں ۔ یہ خود ترحمی اس ملامت کی طرز فکر کا دوسرا انداز ہے ۔ طنز میں تلخی بھی ہوتی ہے اور پیار بھی ۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مردوں کی نسبت عورتوں کو طنز کے ساتھ زیادہ لگاؤ ہوتا ہے ۔ گھڑی بھر میں طنز کے تیروں کی بوچھاڑ اور پھر فوراً ہی پیار کی بھرمار ۔ عورت جس کو چاہتی ہے اسی کے خلاف اس کی طنز زیادہ گہری ہوتی ہے اور پھر :

بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

فن کار کی شخصیت میں نسوانی خصوصیات بھی ہوتی ہیں اور مردانہ بھی ۔ فن کار کی شخصیت ایک آرکسٹرا کی مانند ہے ، یا اسے آہنگِ تضاد کہہ لیجیے ۔ اس طنازی کے ساتھ ساتھ اگر ہم یہ بھی یاد رکھیں کہ غالب کو سب سے زیادہ پیار خود اپنی ذات سے تھا تو یہ مسئلہ بڑی حد تک سلجھ جاتا ہے ۔ جو اپنے کو پیار کرے گا وہی اپنے خلاف طنز کر سکے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ یوں تو غالب دنیا بھر پر طنز کرتے ہیں اور دنیا پر ہی کیا موقوف ہے ، مافوق الفطرت قوتوں کو بھی نہیں بخشتے :

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

لیکن عموماً ان کے خیالات کا محور خود ان کی ذات ہے ۔ اپنے کو بار بار ملامت کرتے ہیں ، اور کبھی تو یہ ملامت انتہا کو پہنچ جاتی ہے ۔ جیسے : "شراب پیتا ہوں سؤر نہیں کھاتا" یا "ایک اور جوتی لگی" ۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ طنز نگاری میں غالب ایک مقام رکھتے ہیں ۔ دوسروں پر بھی انھوں نے طنز کے وار کیے ہیں :

چوں الف بیگ در کہن سالی پسرے یافت سربسر غمزہ
نام او "ہمزہ بیگ" کرد ولے . . . . ہمزہ

۱۔ قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

۲۔ خط بنام قربان علی بیگ سالک ۔

بات اتنی تھی کہ ایک بزرگوار الف بیگ نامی سے غالب کی جلتی تھی ۔ بڑھاپے میں الف بیگ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے حمزہ بیگ رکھا ۔ غالب کو اشغلہ ہاتھ آیا ، حمزہ اور ہمزہ کی تبدیلی سے جو مزاح اس قطعے میں غالب نے پیدا کیا ہے وہ قابل داد ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ الفِ منحنی ہمزہ کہلا سکتا ہے ۔ فرائیڈ[1] نے مزاح کو جنسی جذبے کی کارفرمائی قرار دیا ہے ۔ ذو معنی الفاظ کا استعمال اہل ظرافت ایک خاص مقصد سے کرتے آئے ہیں ۔ سطحی معنی تو وہ ہوتے ہیں جو عموماً مہمل لیکن قطعاً بے ضرر ہوتے ہیں ۔ اصل وہ معنی ہوتے ہیں جو بظاہر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور جن کی طرف محتاط طریقے سے ہی اشارہ کرنا ممکن ہوتا ہے ۔ معاشرے نے ہم پر جو قدغن لگائے ہیں ، ان کا صحیح جواب طنز کے ذریعے ہی دیا جا سکتا ہے ۔ انسانی جبلت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ معاشرے کے قیود سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ اگر انسان ایسا نہ کرے تو دیوانہ ہو جائے ۔ جنس ہماری زندگی میں ایک بنیادی حقیقت ہے لیکن جنسیت کی نمائش معاشرے نے ممنوع قرار دی ہے ۔ طنز و مزاح کے ذریعے ہم اپنے جلے پھپھولے پھوڑتے ہیں ۔ جو بات کھل کر نہیں کہہ سکتے ، اسے اشاروں میں بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتے ۔ یہ قطعہ بھی ایک جنسی لطیفہ ہے ۔

جنسی نوعیت کے لطیفے غالب سے عموماً منسوب نہیں کیے جاتے ۔ ایرانیوں میں عبید زاکانی ، اہل ہند میں جعفر زٹلی ، ضاحک ، سودا اور انشا کے لطائف و اشعار میں جنسی اشارے بکثرت پائے جاتے ہیں ۔ جنسی لطیفے کی ایک سطح وہ ہوتی ہے جب وہ بالکل پھکڑ بلکہ فحش بن جائے ۔ یہ صورت غالب کے ہاں نظر نہیں آتی ۔ جب لطیفہ سنجی اور فحاشی کے درمیان فرق نہ رہے تو ادب کی شان باقی نہیں رہتی ۔ پھر شائستہ اور بازاری مزاح میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے ۔ لیکن بعض اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بحث و مباحثہ اور آویزش انتہا کو پہنچ جائے تو فریقین ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگتے ہیں اور ان کی زبان اور قلم سے ایسے جملے نکل جاتے ہیں جن کی توقع مہذب و شائستہ اکابرِ شعر و ادب سے نہیں کی جا سکتی ۔ غالب تہذیب و شائستگی کے جیتے جاگتے نمونے تھے ۔ قتیل و غالب کی آویزش میں البتہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تہذیب و شائستگی کا دامن غالب کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے ۔ کبھی کبھی جھنجلاہٹ

۱- Freud -

میں کوئی تیز و تند فقرہ غالب کی زبان سے نکل گیا ہے ۔ جنسی لطیفے کی خصوصیت یہ ہے کہ ذومعنی ہو ۔ اوپر کی سطح جتنی سادہ و معصوم ہو گی اور اندر کی سطح جس قدر جنسی مطالب سے معمور ہوگی ، اتنا ہی وہ لطیفہ کامیاب کہلائے گا ۔ کھل کر گالی دینا لطیفے کی تعریف میں نہیں آتا ۔ جنسی لطیفہ تضاد معانی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اسی لیے طنز کی ذیل میں آتا ہے ۔ غالب کی طبیعت میں جو رکھ رکھاؤ تھا اس نے عموماً ان کے لطائف و اشعار کو جنسیت سے آلودہ نہیں ہونے دیا ۔ ایک نقاد کے قول کے مطابق غالب کی ظرافت میں نرمی اور ہمواری کا احساس ملتا ہے ۔ یہ قول نا درست نہیں ۔ غالب اپنی فقرہ بازی میں بھی جولانی طبع دکھاتے ہیں لیکن تیز اور سخت الفاظ سے گریز کرتے ہیں ۔

''ظرافت اور طنز دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ چنانچہ ضروری نہیں کہ طنز میں ظرافت بھی شامل ہو ۔ اگرچہ ظرافت میں طنز موجود ہونے کی شہادتیں ہر ظریف کے ہاں مل جاتی ہیں'' ۔ طنز ایک کلاسیکی صنف ہے ۔ سماج کی اصلاح و تطہیر کا جذبہ ہمیشہ سے انسان کو طنز پر ابھارتا رہا ہے ۔ ادیب اور فلسفی جب اپنے ماحول پر نظر دوڑاتے ہیں تو انھیں سماجی اداروں کی کمزوریاں اور خرابیاں طنز کرنے پر مائل کرتی ہیں ۔ انسانی معاشرہ کوئی فرشتوں کا معاشرہ نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمزوری اور خرابی موجود ہی نہ ہو ۔ مفکروں کے ذہن میں سماج کا جو تصور ہوتا ہے ، سماجی حالات سے اس تصور کا مقابلہ کرنا انھیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ہمارا سماج سر تا پا غلط ہے ۔ اور یہ بے اطمینانی اور خرابیوں کا احساس ان کو اصلاح معاشرہ پر مائل کرتا ہے ۔ اصلاحِ معاشرہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہم اپنے معاشرے پر طنز[1] کریں ۔ بعض اوقات پورے معاشرے کی بجائے ہم چند شخصیتوں کو معاشرے کی خرابیوں کا ذمہ دار قرار دے کر ان کے عیوب پر طنز کرتے ہیں ۔ یہ طنز بھی محض شخصی نہیں ہوتا ۔ طنز کا ہدف کسی شخص کی ذات نہیں ہوتی بلکہ سماج میں اس کی حیثیت ہوتی ہے ۔ یعنی طنز کسی شخص کے اُس کام پر ہوتا ہے جس کا اثر براہ راست دوسرے لوگوں کی زندگیوں پر پڑے اور معاشرے کو متاثر کرے ۔ یہ صورت حال ادب میں کم ازکم قدیم یونانیوں کے زمانے سے قائم ہے ۔ شخصی طنز کو ہجو کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ اگرچہ بعض اوقات ہجو نگاری بھی محض شخصی نہیں ہوتی ۔ مثال کے طور

۱۔ طنز ، پدر دشمنی کے مترادف ہے مگر میں یہ بحث اٹھانے سے دانستہ گریز کرنا چاہتا ہوں ۔

پر سودا کے دونوں ''شہر آشوب'' طنزیہ شاعری کے نمونے کہلائے جا سکتے ہیں ۔ لیکن میر ضاحک پر جو چوٹیں سودا نے کی ہیں وہ ہجو کی ذیل میں آتی ہیں ۔ ہم نے ہجو اور طنز میں جو امتیاز بتایا ہے ، وہ ضمنی ہے اور اس معذرت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ اردو تنقید میں ہجو اور طنز کے درمیان کوئی حد فاصل قرار نہیں دی جاتی ۔ ہم ایک ہی سانس میں کبھی ہجو کا لفظ اور کبھی طنز کا لفظ استعمال کرتے آئے ہیں جیسے یہ دونوں مترادفات ہوں ۔ طنز اور ظرافت میں جو فرق ہے ، اردو تنقید میں اسے بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے ۔ عام طور پر جس ظرافت میں تلخی ہو ، اسے طنز کہہ دیتے ہیں ۔ تنقیدی اصطلاحات کے استعمال کا یہ گول مول طریقہ قارئین کو اصل معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچنے دیتا ، ورنہ حقیقتاً طنز میں غصے اور تلخی کی شدت ہونا کافی ہے ۔ اور اگر قدما کی روایت پر عمل کیا جائے تو طنز کا مقصد اصلاحی ہونا بھی لازمی ہے ۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ عموماً ظرافت اور طنز آپس میں اس قدر گھلے ملے نظر آتے ہیں کہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی سے طنز میں لطف پیدا ہو جاتا ہے ۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مزاح نگاروں کے فرمودات میں ظرافت کے علاوہ عام طور پر طنز بھی موجود ہوتا ہے ۔ وہ محض بذلہ سنجی پر اکتفا نہیں کرتے ۔ البتہ طنز نگار کے لیے ضروری نہیں کہ ظریف الطبع بھی ہو ۔ غالب کے ہاں طنز اور ظرافت کا ایک حسین امتزاج ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات ان کی طنز میں شوخی اور ظرافت میں تلخی نظر آتی ہے ۔

غالب کی طبیعت کے رکھ رکھاؤ کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ شریف گھرانوں کی ایک امتیازی شان یہ بھی تھی کہ طنز میں ایمائی کیفیت قائم رہے ۔ کھل کر بات کہنا اور سوقیانہ طریقے سے کیچڑ اُچھالنا شرافت سے بعید خیال کیا جاتا ہے ۔ پھر غالب تو قدیم شرافت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پردے پردے میں اور ایمائی انداز کے ساتھ طنز کے وار کیے ہیں ۔ کبھی کسی شاگرد کو ٹوکنا منظور ہو تو یوں ٹوکتے ہیں کہ بھائی میں تو تمھیں بہت صاحبِ ذوق سمجھتا تھا لیکن تم نے اچھے برے میں تمیز نہ کی ۔ قتیل یا فارسی گویانِ ہند میں سے کسی کی سند غالب کے سامنے پیش کی جاتی تو عموماً اپنی ہمہ دانی کے ادعّا کے با وصف لطیف پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کرتے اور خود سند دینی منظور ہوتی تو کسی مستند ایرانی شاعر کی سند لاتے تاکہ شک رفع ہو جائے ۔ عموماً اپنے سے چھوٹوں اور اپنے شاگردوں کو بڑے احترام سے خطاب کرتے ۔ خط پڑھیے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب غالب کا

شاگرد نہیں یا چھوٹا نہیں بلکہ کوئی ہم مرتبہ شخص ہے ۔ بعض اوقات تو یہ گمان ہوتا ہے کہ غالب اسے اپنے سے بلند تر سمجھتے ہیں ۔ یک لخت کوئی مطلب کی بات چھیڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت یہ آپ نے کیا فرما دیا ، یہاں محاورہ غلط ہے یا کوئی فنی نقص واقع ہوا ہے ۔ ایک ہی خط میں دو لہجے مجتمع ہو جاتے ہیں ۔ کہاں تو وہ تکریم و احترام اور کہاں یکایک فنی گرفت ، پھر کہیں جا کر قاری پر اصل معاملہ کھلتا ہے ۔ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تعریفی الفاظ محض روایتی شرافت کا مظہر ہیں ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ مخاطب کو محض طفلِ مکتب جانتے ہیں ۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ غالب خود اپنی عظمت سے پوری طرح آگاہ تھے ۔ اس آگاہی کے باوجود کسی خورد یا شاگرد کے لیے تعظیم و تکریم در اصل شخصی طنز کا ایک خوبصورت نمونہ ہے ۔ کسی نے ایک غیرمعروف شاعر اسد کا یہ مطلع ان کے سامنے یہ سمجھ کر پڑھ دیا کہ انھی کا ہے :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

فرمایا کہ جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت ۔ اس قول میں وہی رنگ جھلک رہا ہے جو اس فارسی قطعے میں جھلکتا ہے جو ذوق سے متعلق ہے ، اس قطعے میں ذرا کھل کر کہا ہے کہ جو آپ کے لیے فخر ہے ، وہ میرے لیے ننگ ہے ۔ غالب عموماً اتنی صفائی کے ساتھ بھی بات کہنے کے عادی نہ تھے :

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا

ابتداءً ذوق پر چسپاں کیا تھا اور خوب چسپاں کیا تھا لیکن آویزش سے بچنے کے لیے خود اپنے پر ڈھال لیا :

وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے ؟

اسی طرح ایک اور شعر جو سہرے کی معذرت کے سلسلے میں کہا گیا ، ایک خاص اشارے کا غماز ہے :

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری

اصل مقصد تلوار اور اُسترے کا مقابلہ تھا ۔ غالب سپاہی زادے تھے اور ذوق کے متعلق دوسری بات مشہور تھی ۔ سپاہی زادہ ہونا غالب کے لیے شاعر ہونے سے بڑھ کر وجہِ افتخار تھا ۔ اس لحاظ سے شاعری ان کے لیے ذریعۂ عزت نہیں ہو سکتی تھی ۔ البتہ ذوق کے لیے شاعری کے سوا کوئی ذریعۂ عزت اور نہیں ہو سکتا تھا ۔ یہ ایک ایسا اشارہ ہے جسے غالب کے زمانے میں ہر شخص

سمجھ سکتا ہوگا - پھر بھی غالب نے اپنی زبان کو آلودۂ ہجو نہیں ہونے دیا - غالب کی جگہ انشا ہوتے تو مصحفی و مصحفن والے سوانگ سے بھی بڑھ کر کوئی نرالا ہی سوانگ رچاتے - شخصیات سے قطع نظر ایمائی رنگ غالب کی طبیعت میں داخل تھا - اول تو غزل کی روایت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں وہی بات پُرلطف معلوم ہوتی ہے جو ایمائی رنگ میں کہی جائے - سونے پر سہاگا غالب کی شرافت تھی ، یعنی قدیم گھرانوں کی روایتی وضع داری اور رکھ رکھاؤ - اُس قطعے کا ذکر کیا جا چکا ہے جو غالب نے بہادر شاہ ظفر کی حضور میں گزرانا تھا - غالب کی طنز محض شخصی نہیں بلکہ حقیقتاً محض سماجی بھی نہیں ، اس میں آفاقیت ہے :

(۱)

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(۲)

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا ؟

(۳)

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دیوانِ اردو ، کلیاتِ فارسی اور مکتوب کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ شخصیات ، معاشرے اور مابعدالطبیعیاتی موضوعات پر غالب نے طنزیہ انداز میں ظریفانہ حاشیے کے ساتھ کس طرح خیال آرائی کی ہے ؟ تو مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں ایک وسیع مضحک آئیڈیل (Ideal) کا نقش اُبھرتا ہے - طنز و ظرافت کے آمیختے سے غالب نے جو کائنات بنائی ہے ، اس کی وسعت اور ہمہ گیری پوری طرح ہمارے ذہن کی گرفت میں بھی نہیں آ سکتی - جب روایتی قدریں بدلتی ہیں تو عظیم فنکاروں کے ذہن میں ایک مضحک کائنات کا نقشہ ابھرتا ہے - یہ مضحک کائنات جن اجزائے ترکیبی سے بنتی ہے ، ان کا ہر جزو ایسا ہوتا ہے جس پر تشکیک کی مُہر لگی ہوتی ہے - نہ اشخاص کے کردار پر یقین آتا ہے ، نہ معاشرے کی قدروں پر - اشخاص اور معاشرہ تو پھر اس عالمِ سفلی سے تعلق رکھتے ہیں ، بےیقینی اور تشکیک اگر فنکار کے ذہن پر چھا جائے تو وہ آسانی

حقیقتوں پر بھی شک کرنے لگتا ہے ۔ اسے نہ اپنے پر یقین ہوتا ہے ، نہ دوسروں پر ، نہ سماج پر ، نہ مذہبی اعتقادات کی صداقت پر ، یہ ایک جنونی کیفیت ہوتی ہے ۔ اگر فن کار اس جنونی کیفیت سے بچنا چاہے تو اس کا بظاہر ایک ہی طریقہ ممکن ہے : وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے کی بجائے اپنے لہجے کو نرم کر کے اور بات میں ایمائی انداز لا کر ہر چیز پر طنز کرنے لگتا ہے :

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس کے معنی یہ نہیں کہ غالب کے ہاں شوخی اور خوش دلی کے نمونے نہیں ہیں ۔ اس کے برعکس یہ کہنا بجا ہوگا کہ غالب کی پہلو دار طبیعت میں ایک پہلو شوخی اور خوش دلی کا بھی ہے ۔ جیسے سرورِ مے کی کیفیت اور نشہ کبھی بگڑ بھی جاتا ہے :

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

پلا دے اُوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

''بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہو جانا اور رسائلِ ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ . . . . میں غوطے مارنا اَور ہے ، اور عرفا کے کلام سے حقیقتِ حقہ' وحدتِ وجود کو دل نشیں کرنا اَور ہے''۔ (خط بنام علائی)

لیکن جب سرور کی کیفیت ہوتی ہے تو بات بڑے دلنشیں انداز میں کہتے ہیں :
''لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے ۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا قوام پتلا ۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے ، ہاں فرہنگ سرور میں ہوں سو ہوں ۔'' (خط بنام تفتہ)

''ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں ، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں ، پیو ، کھاؤ ، مزے اُڑاؤ ، مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو ، شہد کی مکھی نہ بنو ۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے . . . . میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی ، اقامت جاودانی ہے اور اسی

ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے ، اس تصور سے جی گھبراتا ہے - ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی ، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی ، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ - چشمِ بد دور ، وہی ایک حور . . . .'' :

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار کہ تقویمِ پارینہ ناید بہ‌کار

(خط بنام میرزا حاتم علی بیگ سہر)

''مولانا غالب علیہ الرحمہ ان دنوں بہت خوش ہیں - پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد 'بوستانِ خیال' کی آ گئی ہے ، سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں - دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں ، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں -'' (خط بنام مجروح)

یہی خوش دلی جب شعری پیکر اختیار کرتی ہے تو اُس کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے :

در پر آنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اس وضع کے اشعار کو خالص مزاح کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے - یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالب چھوٹی چھوٹی چیزوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے - اِملی کے پھول ہوں تو ترش ضرور ہوں ، آم ہوں تو میٹھے ہوں اور بہت ہوں ، کریلے ہوں تو کڑوے - غرضکہ زندگی کی بڑی بڑی تلخیوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ کر ، زندگی کی چھوٹی چھوٹی لذتوں کو دوسرے پلڑے میں رکھتے ہیں اور پھر تولتے ہیں - ایک حسّاس طبیعت کے لیے یوں بھی زندگی کچھ کم تلخ نہیں ہوتی ، پھر غالب تو بڑے ہی حسّاس تھے - دوسری جانب جس دور سے وہ گزر رہے تھے ، تاریخی اعتبار سے بھی وہ ایک بے اطمینانی کا دور تھا - ۱۸۵۷ع کے آس پاس یہ دور انتہائی اذیت انگیز ہوگیا ہوگا - پھر بھی زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے منہ موڑنا ممکن نہیں - حالات خواہ کچھ ہی ہوں ، ان کا مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے - چنانچہ غالب تلخیِ حالات کا مقابلہ ان چھوٹی چھوٹی راحتوں اور لذتوں کے ذریعے کرتے تھے - ایک جگہ کہتے ہیں کہ ''میں ڈرتا ہوں تو نقدانِ راحت سے'' یعنی چھوٹی چھوٹی راحتیں حاصل رہیں تو بڑے بڑے غموں کو بھلایا جا سکتا ہے -

غالب کھانے پینے میں حسنِ ذوق اور نفاست طبع کا لحاظ بدرجۂ اتم رکھتے تھے - یہی کیفیت ان کی شاعری کے آئینے میں نظر آتی ہے :

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

خوش دلی اور خوش طبعی کے آئینہ دار جو اشعار ہیں ، بہ اعتبارِ تعداد خالصتاً طنزیہ اشعار سے کہیں زیادہ ہیں ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے شوخی اور خوش دلی کو ان کی طبیعت کا عنصرِ غالب بتایا ہے ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عظیم خیالات سے کھیلتے تھے ، یعنی بڑے بڑے فلسفیانہ خیالات ان کے ذہن میں کروٹیں لیتے رہتے تھے لیکن اپنی شوخ طبعی کی وجہ سے وہ ان خیالات کو ظریفانہ پیرایے میں ظاہر کرنا پسند کرتے تھے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے کلام میں سنجیدگی اور گونج گرج کی کیفیت ہوتی ۔ اس کے برخلاف وہ ان خیالات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ظریفانہ اور پُر لطف بن جاتے ہیں ۔ غالب کو ایک فلسفی شاعر بھی قرار دیا گیا ہے ، لیکن وہ جس طرح ان فلسفیانہ خیالات سے کھیلتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے گویا عظیم خیالات ہی ان کے لیے محض کھلونے ہیں ۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں اہمال اور ابہام کی کیفیت اتنی زیادہ کیوں ہے ؟ اور پختگی کے دور میں اہمال و ابہام طنز و ظرافت کا پیکر کیوں اختیار کر لیتے ہیں ؟ ہمارے نزدیک اہمال و ابہام اور طنز و ظرافت میں کوئی بنیادی تضاد موجود نہیں ہے ۔ ابتدا میں کچھ ایسی صورت معلوم ہوتی ہے کہ حالات کا گورکھ دھندا شاعر کے خیالات کو الجھنوں میں ڈال دیتا ہے ۔ ہر چیز بے معنی نظر آتی ہے ، ہر چیز مضحک ہے ، لیکن شاعر حالات سے بلند ہونے کی قدرت نہیں رکھتا ، بلکہ اپنی ذہنی کیفیت کے لیے الفاظ کے سوزوں سانچے بھی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ شعر بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے ۔ آخر کار شاعر ان گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ قدرتِ کلام کے سبب سے مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ تصورات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے ۔ کبھی اپنے پر ہنستا ہے ، کبھی دوسروں پر ۔ اس طرح تنقیحِ جذبات اور تطہیرِ احساسات رونما ہوتا ہے ۔ خیالات میں روشنی پیدا ہوتی ہے ، اظہار میں صفائی اور سلاست آ جاتی ہے ۔ آخری دور کا کلام اتنا دلنشین ہے کہ یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ نوجوانی میں اس شاعر نے اتنے الجھے ہوئے شعر کہے ہوں گے ۔ غرض کہ طنز و ظرافت اگرچہ غالب کی عظمت کی تنہا دلیل نہیں ہے لیکن اس کے ذریعے غالب عظمت کی منزل پر فائز ہوتے ہیں ۔

غالب جس ماحول کی پیداوار تھے اور جو بیدار ذہن اور حساس طبیعت انہیں ملی تھی ، اس کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت طنز و ظرافت

کے رنگ میں نمایاں ہو۔ وہ دو تہذیبوں کے سنگم پر کھڑے تھے ، یا یوں کہہ لیجیے کہ دو راہے پر ۔ یہ ایک عبوری دور تھا ۔ زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا ۔ پچھلی تمام قدریں منسوخ بلکہ ساقط ہوتی جا رہی تھیں ۔ آنے والا زمانہ غیر واضح اور مبہم تھا ۔ حساس طبع کے لیے ایسا عبوری دور بحرانی ثابت ہوا کرتا ہے ۔ زندہ رہنے کے لیے اور اپنے ذہن کو صحت مند رکھنے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ حساس فن کار اپنے دور کی اقدار کو کسی نہ کسی طور پر درست تسلیم کرے اور بدلتی ہوئی اقدار کا جواز ڈھونڈ نکالے ۔ جب سر سید نے ''آئین اکبری'' میں مغل عظمت کے نقش کو از سرِ نو زمانے کے سامنے پیش کیا تو انھیں یہ توقع ہوئی کہ غالب بھی اسلاف کے کارناموں کے گن گائیں گے ۔ لیکن غالب نے ایسا نہ کیا ۔ انھوں نے اپنی فارسی تقریظ میں صاحبانِ انگلستان کی تعریف کے پل باندھ دیے ۔ یہاں یہ تصور کرنا سراسر ناانصافی کے مترادف ہوگا کہ غالب کا دور محض انگریز پرستی تھا ۔ غالب کی طبیعت میں طنز کا جوہر تھا اور طنز نگار وہی ہے جو ہر ادارے کا نقص پیش نظر رکھے ۔ بالطبع غالب طنز نگار تھے ۔ انھیں عظمتِ کہن میں بھی نقائص ہی نقائص نظر آتے تھے اور آنے والے زمانے سے وہ بھلائی کی توقعات اس لیے وابستہ رکھنا چاہتے تھے کہ زندگی پُر امید معلوم ہو ، نہ کہ محض بے مقصد ۔ پھر بھی تشکیک کا عنصر ان کی طبیعت کا عنصرِ غالب ہے ۔ غالباً پوری کوشش کے بعد وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے ۔ ان کی شاعرانہ شخصیت کا ارتقا یہی ثابت کرتا ہے ۔ نسخۂ حمیدیہ کا وہ حصہ جو بعد کو انھوں نے خارج کر دیا تھا ، بڑی حد تک ایسے افکار و خیالات پر مشتمل ہے جن میں جنونی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ اسے عالمِ جذب کی شاعری کہنا چاہیے ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہوش میں آتے چلے گئے ۔ طنز و ظرافت کا پیرایہ اختیار کرنا ہوش مندی کی دلیل ہے ۔ بات میں سے بات نکالنا ، بڑے بڑے فلسفیانہ خیالات کو لطیفہ بنا کر پیش کرنا ، فلسفیانہ تصورات سے کھیلنا ، اپنے اور دوسروں پر طنز کے تیر برسانا ، گاہے گاہے خالص مزاحیہ طرز اختیار کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ طنز و ظرافت کے ذریعے غالب نے اپنی بحرانی کیفیت کا خود علاج کیا ہے ۔

طنز و ظرافت میں غالب کا مقابلہ سودا ، نظیر اور انشا وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے باوجود جب میں غالب کی شخصیت پر سوچتا ہوں تو میرے سامنے شیکسپیئر کی تصویر ابھرتی ہے ۔ وہ شیکسپیئر جو فالسٹاف (Falstaff) کا خالق تھا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ میرا ذاتی احساس ہو ۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ فالسٹاف کی تاریخی حیثیت مستند نہیں بلکہ نزاعی ہے ۔ بہر حال مجھے فالسٹاف

مجلس ترقی ادب کی کارگزاری

(صحیفہ کے بارے میں آرا)

مس زیتون عمر صاحبہ (آکسفورڈ)

I have received your edition of the Ghalib number of SAHIFA ; may I congratulate you on an issue that even Ghalib may have smiled at, for it is both learned and readable. In England, it is particularly nice to see such labour being taken at home. I look forward to the following numbers.

ڈاکٹر حامد حسین صاحب (بھوپال)

صحیفے کے دونوں شمارے میں نے دیکھے ۔ بلاشبہ یہ غالب پر تحقیق و تنقید میں ایک دستاویزی اہمیت کے مالک ہیں ۔ تازہ شمارہ زیادہ تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا اور جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ، وہ ان مضامین کی فکر انگیزی کے ساتھ ساتھ ان کی ایک ایسی اعلیٰ ہم معیاری ہے جو عموماً ایسے مجموعہ ہائے مضامین میں بڑی دشواری سے پیدا ہوتی ہے ۔ اسے میں آپ کی پرخلوص ادارت ہی کا نتیجہ سمجھتا ہوں ۔ اس نمبر کی ایک امتیازی خصوصیت مجھے وہ رچا ہوا مذاقِ علم و ادب معلوم ہوا جو مغرب کے معیار نقد و تحقیق سے کسب فیض کرکے مشرق کے فن و ادب کے معاملے میں مددگار ثابت ہوا ہے ۔

شمس الرحمان فاروقی صاحب (لکھنؤ)

حیرت ہے کہ اس کے بعد بھی آپ دو شمارے غالب پر وقف کر دیں گے ۔ آپ کی ہمت اور Resource کی داد نہیں ہے ۔ زیر نظر شمارے میں افتخار جالب کا مضمون بہت پسند آیا ۔ آپ کی یہ Catholicism بھی قابل داد ہے کہ آپ افتخار جالب جیسے آزاد خیال نقادوں کی تحریریں بھی شائع کرتے ہیں اور پرانے محققوں کی بھی ۔ بہت خوشی ہوئی ۔

ڈاکٹر عبدالاحد خلیل صاحب (لکھنؤ)

آپ نے جس کاوش اور دانش سے مرزا غالب سے عقیدت اور خلوص کا منظم و مربوط ثبوت فراہم کیا ہے، وہ قابل مبارک باد ہے۔ مضامین کی رنگا رنگی اور بلند معیاری قابل داد ہے۔ مقالات مشمولہ سے غالب کے عہد کی ہو بہو تصویریں بھی سامنے آ جاتی ہیں اور خود ان کی شخصیت اور مزاجی کیفیت کی آئینہ داری بھی ہو جاتی ہے۔ جزاک اللہ۔

غالب کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں صحیفہ کی ترتیب و تدوین میں آپ نے جو منصوبہ بندی کی ہے اور اپنی غالب نوازی کو پورے سال کی اشاعتوں پر پھیلا دیا ہے، یہ بدعت یا سعادت آپ ہی کا حصہ ہے اور مستحق ستائش ہے۔ ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں ان مساعی کا یقیناً گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جا رہا ہے اور کیا جائے گا۔ اب تک غالب نمبر کے جتنے رسائل شائع ہوئے، ان میں کوئی کچھ کہہ کر خاموش ہو گیا اور کوئی سب کچھ۔ لیکن پوری جہان بین کے ساتھ مختلف مکتبۂ خیال کے لوگوں کو غالب کے سلسلے میں دعوت فکر و نظر دینا اور اظہار خیال کے مواقع فراہم کرنا آپ ہی کی ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔

آپ کی ان مساعی اور منصوبہ بندیوں میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غالب شناسی اور ادب نوازی کا یہ انداز محض خانہ پری، ظاہر داری یا نام و نمود کی خاطر نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں خلوص و محبت اور خالص ادبی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے، جو لازمی طور پر مرزا غالب کے لیے ہردل میں جگہ بنانے میں ممد و معاون ہوتا ہے اور ان کی قدر و منزلت کو واضح کرتا ہے۔

ڈاکٹر مناظر احسن ہرگانوی صاحب (بھارت)

''صحیفہ'' غالب نمبر حصہ دوم اپنے دامن میں معیار و انفرادیت سمیٹے ہوئے موصول ہوا، شکریہ۔ یہ مختصر مگر خوشنما گلدستۂ گلہائے رنگ رنگ لاجواب ہے۔ ہر مضمون سے اس کے لکھنے والے کی اپنی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کی محنت لائق ستائش ہے۔

ڈاکٹر لئیق بابری صاحب (لاہور)

''صحیفہ'' غالب نمبر کی اشاعت پر مبارک باد بھیجتا ہوں۔ پرچے کا بلند معیار آپ کی ہمتوں کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب (لاہور)

ایک موضوع پر نمبروں کے سلسلے کا اجراء ہماری مجلاتی صحافت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا ۔ آپ نے ایک نئی مثال قائم کردی اور طرہ یہ کہ معیار بھی بلند رکھا ۔ جب سے آپ نے صحیفہ کی ادارت سنبھالی ہے ، اس کی صورت بڑی باقاعدگی سے نظر آتی ہے ۔

رسالہ اردو زبان (سرگودھا)

مجلس ترقی ادب لاہور کا سہ ماہی ''صحیفہ'' جب سے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے ، تحقیق ادب کا ایک قابل قدر جریدہ بن گیا ہے ۔ زیر نظر شمارہ اس کا غالب نمبر ہے ۔ یہ پرچہ پانچ سو صفحات پر محیط ہے اور اس میں چھبیس نامور اہل قلم کے مضامین شائع کیے گئے ہیں ۔ تحقیقی مضامین میں سے عتیق صدیقی ، سید قدرت نقوی ، عبدالسلام خورشید ، مرتضیٰ حسین فاضل ، قاضی عبدالودود اور خواجہ احمد فاروقی کے مضامین بے حد اہم ہیں ۔ تفہیم غالب کے سلسلے میں میرزا محمد منور ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ڈاکٹر عندلیب شادانی ، اور مولانا غلام رسول مہر نے غالب کی شاعری اور نثر کے کچھ روشن نقوش پیش کیے ہیں - تنقیدی حصے میں ڈاکٹر وزیر آغا ، جیلانی کامران ، نظیر صدیقی ، اختر اقبال کمالی ، اسلوب احمد انصاری اور انور سدید کے مضامین دل چسپی سے پڑھے جائیں گے ۔ کلام غالب کے انگریزی میں دو ترجمے بھی شائع کیے گئے ہیں ۔ مجموعی طور پر زیر نظر ''غالب نمبر'' غالب شناسی میں بہت مدد دے گا ۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب (کراچی)

صحیفہ کو آپ نے جس بلند معیار تک پہنچا دیا ہے ، اب وہ کسی رسمی تبصرے یا تعارف کا محتاج نہیں رہا ۔ اب تو صرف یہ دعا ہے ۔ کہ خدا آپ کو اور آپ کے پرچے کو نظر بد سے بچائے !

ریڈیو پاکستان (لاہور)

''صحیفہ'' کا غالب نمبر اس لحاظ سے برعظیم کے سب رسائل پر فوقیت حاصل کر گیا ہے کہ اس میں پاکستان اور بھارت کے بعض چوٹی کے ماہرین غالبیات کی نگارشات شامل ہیں ، اور پھر یہ کہ یہ سب مضامین تازہ بہ تازہ ہیں ۔ زیر تبصرہ غالب نمبر حصہ اول میں مرزا غالب کی شاعری ، نثر اور فکر و فن کے

مختلف پہلوؤں پر ۲۲ مضامین شامل ہیں ۔ غالب کے چند منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ جو صوفی نیاز اور زیتون عمر نے کیا ہے ، اس کے علاوہ ہے ۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا مضمون ''غالب کا زمانہ'' اپنے اختصار کے باوصف اس عہد کی سیاسی ، معاشرتی ، ادبی اور لسانی تحریکات کے بارے میں وسیع مطالعے کا نچوڑ پیش کرتا ہے ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، عتیق صدیقی اور مرتضٰی حسین فاضل نے صحافت کے حوالے سے حیات غالب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ غالب کی فارسی اور اُردو نثر پر چار مضامین ہیں ۔ مختصات نثر غالب ، مرزا غالب کا اُسلوب نگارش ، غالب اور ذال معجم ، محاسن خطوط غالب ۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مرزا غالب کے اسلوب نگارش کا پنج آہنگ کے حوالے سے جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ غالب نے ابوالفضل کی جدت طرازی سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور آئین اکبری کی روش خاص کے بنیادی عناصر کو اپنی تحریر کی اساس ٹھہرایا ہے ۔ غالب کی فارسی شاعری پر ڈاکٹر عبدالغنی اور مرزا محمد منور کے مضامین قابل قدر ہیں ۔ غالب پر بیدل کے اثرات ایک اہم موضوع ہے ۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے غالب کے سفر کلکتہ اور بیدل کے ضمن میں بتایا ہے کہ غالب کی مثنویات 'چراغ دیر' اور 'باد مخالف' بیدل کے قلزم فیض سے سیرابی کا نتیجہ ہیں ۔ غالب کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر صحیفے میں کئی قابل قدر مضامین شامل ہیں ۔ خصوصاً اسلوب احمد انصاری کا مضمون ''ابر گوہربار کا ایک پہلو'' اختر اقبال کمالی کا ''کلام غالب میں تمثال شعری کا مقام'' جیلانی کامران کا ''غالب کی تہذیبی شخصیت کا تعارف'' نظیر صدیقی کا ''غالب کی فن کارانہ ہمہ گیری'' یہ سب مضامین بڑے وسیع مطالعے اور طویل سوچ بچار کا حاصل کہے جا سکتے ہیں ، خصوصاً اختر اقبال کمالی کا مضمون ''کلام غالب میں تمثال شعری کا مقام''۔

مالک رام صاحب (بھارت)

یہاں (ہندوستان میں) بھی چند پرچوں نے خاص نمبر شائع کیے لیکن ان میں سے کوئی نقوش اور صحیفہ کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا ۔

آغا سہیل صاحب (لاہور)

صحیفہ کا تازہ شمارہ پہنچا ۔ اس سے قبل غالب نمبر بھی ملا تھا ۔ اب تک جتنے رسالوں کے غالب نمبر شائع ہو چکے ہیں ، ان میں آپ کا غالب نمبر منفرد بھی ہے اور وقیع بھی ۔ اچھی تنقید مستحکم تحقیق کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے ۔

بلکہ تخلیق میں بھی معین و مددگار ہوتی ہے ۔ اس لحاظ سے آپ نے اچھے اچھے تحقیقی و تنقیدی مقالات اکٹھا کیے ہیں ۔ یہ سلیقہ بہر حال آپ کی مسلسل کد و کاوش کا نتیجہ ہے ۔

سلیم اختر صاحب (ملتان)

صحیفہ کا غالب نمبر ۲ مل گیا ۔ آپ نے تو کمال کر دیا ہے ۔ چاروں بار غالب نمبر ہوں گے ۔ گویا آپ تمام سال اہل علم کو غالب کی عظمت کا اعتراف کراتے رہیں گے ۔ اس دوران میں بلند پایہ مقالات طبع ہوں گے ۔ ان کی افادیت سے قطع نظر خود یہ انداز نظر بھی غالب کو خراج عقیدت سے کم نہیں ۔ آپ اسے نہ دیکھیں ، بات نہ سمجھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ نے مل کر غالب کے سلسلے میں تمام امکانی پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے ۔ میری طرف سے ہدیۂ تہنیت قبول ہو ۔

خواجہ حمید الدین شاہد صاحب (کراچی)

سب سے پہلے میں آپ کو ''صحیفہ'' کے غالب نمبر کی دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔ یہ نمبر غالبیات پر کام کرنے والوں کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہے ۔ اس کی ترتیب و تدوین میں آپ نے جو زحمت آٹھائی ہے ، وہ قابل داد ہے :

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

انور سدید صاحب (سرگودھا)

زیر نظر پرچہ اس لیے بہت اہم ہے کہ اس میں غالب کو نئی تنقید کے آئینے میں پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب (سرگودھا)

صحیفے کے دونوں غالب نمبر مل گئے ہیں ، پڑھ بھی لیے ہیں ۔ ماشاءاللہ بڑی محنت کی ہے ۔ آپ نے تو غضب کر دیا کہ پورے سال کے یعنی چاروں نمبر ہی غالب کی نذر کر دیے ۔ ادب کے شائقین اور غالب کے عقیدت مندوں پر آپ کا یہ احسان بھلایا نہیں جا سکے گا ۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ادب کی یہ 'غالب فصل' پوری کی پوری ہی کاٹ لی ۔

سید سبط حسن صاحب (کراچی)

صحیفے کے دونوں غالب نمبر بھی ملے ۔ یوم غالب کی مصروفیتوں کی وجہ سے فقط سرسری طور پر پڑھ سکا ہوں ۔ ماشاءاللہ آپ نے بڑے مفید اور دلچسپ مضامین شائع کیے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں صحیفے کا معیار ترقی کرتا رہے گا ۔

رسالہ سیارہ (لاہور)

ایک نیم سرکاری ادارے کا ترجمان ہونے کے باوجود صحیفہ بھی عام ادبی مجلوں سے مختلف نہ تھا اور اچھی خاصی دیر تک اس کی ترتیب بھی عام پرچوں ایسی ہی رہی لیکن کچھ مدت سے ، بالخصوص جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے زیر ادارت آنے کے بعد صحیفہ اب ایک تحقیقی مجلہ بن گیا ہے اور اس میں ایک اعلیٰ ادبی تحقیقی مجلہ کی ساری خصوصیات نظر آتی ہیں ۔ زیر نظر مجلہ بس نام کی حد تک ''دس سالہ قومی ترقی نمبر'' ہے ورنہ اول تا آخر اس خصوصی نمبر میں اس نام کی مناسبت کہیں بھی نظر نہیں آتی ۔ اداریہ میں مدیر نے پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال کے عنوان سے سیر حاصل گفتگو کی ہے اور گوہر نوشاہی نے چند صفحات میں مجلس ترقی ادب کی دہ سالہ تحقیقی خدمات کا جائزہ لیا ہے ۔ اس شمارۂ خصوصی میں نو تحقیقی مقالات ہیں اور مباحث ، سفر نامہ ، علاقائی ادب ، تصحیح متن اور فارسی ادب کے عنوانات کے تحت مختلف اہل قلم نے داد تحقیق دی ہے ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ عام ادب کے پرچوں میں تحقیقی مقالات کو دیکھ کر جس خشکی اور بے ربطی کا احساس ہوتا ہے ، ایک خاص موضوع پر شائع ہونے والے پرچے میں انہیں دیکھ کر مسرت ہوتی ہے ۔

ڈاکٹر بشیر حسین صاحب (لاہور)

در اصل کسی علمی و ادبی رسالے کو کامیابی سے جاری رکھنے اور اسے ایک خاص معیار تک لانے کے لیے چند بنیادی تقاضوں کو پورا کرنا ہوتا ہے ۔ سب سے پہلے ناظم و مدیر کا علمی تجربہ جس سے کسی رسالے کا وقار وابستہ ہوتا ہے ۔ دوسرے مدیر کے لکھنے والوں سے ذاتی روابط اور حسن سلوک ۔ تیسرے حسن انتخاب اور تصحیح و ترتیب اور چوتھے حسن طباعت و اشاعت ۔

آپ کے اس شمارے نے یہ سارے تقاضے کما حقہ پورے کیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سارے مقالے معیاری اور اعلیٰ تحقیق کا نمونہ ہیں ۔ رسالے کی مزید کامیابی کے لیے دعا گو ہوں ۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (امریکہ)

غالب نمبر حصہ اول ملا تھا ۔ حصۂ دوم کا ہنوز انتظار ہے ۔ نمبر آپ نے خوب نکالا ہے ۔ نہایت جامع اور ہر لحاظ سے اہم ۔ ادھر صحیفہ کا معیار اور بھی بڑھا ہے اور ہر صفحے سے آپ کی ادارت کا ثبوت ملنے لگا ہے ۔

چٹان (لاہور)

''صحیفہ'' کا غالب نمبر اس لحاظ سے بر عظیم کے سب رسائل پر فوقیت حاصل

کر گیا ہے کہ اس میں پاکستان و بھارت کے بعض چوٹی کے ماہرین غالبیات کی نگارشات شامل ہیں ۔ اور پھر یہ کہ یہ سب مضامین تازہ بہ تازہ ہیں ۔ زیر تبصرہ غالب نمبر حصہ اول میں مرزا غالب کی شاعری ، نثر اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر ۳۲ مضامین شامل ہیں ۔ غالب کے چند منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ جو صوفی نیاز اور زیتون عمر نے کیا ہے ، اس کے علاوہ ہے ۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا مضمون ''غالب کا زمانہ'' اپنے اختصار کے باوصف اس عہد کی سیاسی ، معاشرتی ، ادبی اور لسانی تحریکات کے بارے میں وسیع مطالعے کا نچوڑ پیش کرتا ہے ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، عتیق صدیقی اور مرتضیٰ حسین فاضل نے صحافت کے حوالے سے حیات غالب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ غالب کی فارسی اردو نثر پر چار مضامین ہیں ۔ مختصات نثر غالب ، مرزا غالب کا اسلوب نگارش ، غالب اور ذال معجم ، محاسن خطوط غالب ۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مرزا غالب کے اسلوب نگارش کا تنج آہنگ کے حوالے سے جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ غالب نے ابوالفضل کی جدت طرازی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور آئین اکبری کی روش خاص کے بنیادی عناصر کو اپنی تحریر کی اساس ٹھہرایا ہے ۔ غالب کی فارسی شاعری پر ڈاکٹر عبدالغنی اور مرزا محمد منور کے مضامین قابل قدر ہیں ۔ غالب پر بیدل کے اثرات ایک اہم موضوع ہے ۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے غالب کے سفر کلکتہ اور بیدل کے ضمن میں بتایا ہے کہ غالب کی مثنویات 'چراغ دیر' اور 'باد مخالف' بیدل کے قلزم فیض سے سیرابی کا نتیجہ ہیں ۔ غالب کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر صحیفے میں کئی قابل قدر مضامین شامل ہیں ۔ خصوصاً اسلوب احمد انصاری کا مضمون ''ابر گوہر بار کا ایک پہلو'' ۔ اختر اقبال کمالی کا ''کلام غالب میں تمثال شعری کا مقام'' جیلانی کامران کا ''غالب کی تہذیبی شخصیت کا تعارف'' نظیر صدیقی کا ''غالب کی فنکارانہ ہمہ گیری'' ۔ یہ سب مضامین بڑے وسیع مطالعے اور طویل سوچ بچار کا حاصل کہے جا سکتے ہیں ۔

مولانا غلام رسول مہر ، قاضی عبدالودود ، خواجہ احمد فاروقی ، آغا باقر ، ڈاکٹر حکم چند نیر ، ڈاکٹر وزیر آغا ، کسریٰ منہاس اور انور سدید کے مضامین بھی معلومات افزا ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ''صحیفہ'' کا غالب نمبر تحقیقی ، فکری اور فنی اعتبار سے سلسلۂ غالب کی ایک ایسی دستاویز بن گیا ہے کہ جسے محتاط جائزے کے بعد لا مثال کہا جا سکتا ہے ۔

عزیز احمد صاحب (کینیڈا)

صحیفہ کا غالب نمبر جلد اول بھیجنے کا بہت بہت شکریہ ۔ آپ نے اسے بڑی

قابلیت سے مرتب کیا ہے اور یہ مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے ۔ اس کی دوسری جلد جب بھی شائع ہو ، ضرور عنایت فرمائیں ۔

ماجدالباقری صاحب (راولپنڈی)

صحیفہ کا غالب نمبر حصہ دوم اپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے کسی طرح بھی حصہ اول سے کم نہیں ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے آپ نے تحقیقی مضامین مجتمع کر کے تحقیق اور تدقیق کا میدان مارا ہے اور اس بار تخلیقی اور تنقیدی مضامین یک جا کر کے جریدے کی انفرادیت کو قائم کیا ہے ۔ مضمون نگاروں نے انتہائی نازک اور اچھوتے موضوعات کے حوالے سے غالب کے فکر و فن کا احاطہ کیا ہے ۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ نئی نسل کے نمائندہ نقاد اپنی منفرد انشاء پردازی اور ذہنی رویوں کی وجہ سے صاف صاف پہچانے جاتے ہیں ۔

میں سمجھتا ہوں کہ حصہ دوم کا مطالعہ غالب کے فکر و فن کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے اور اسے عام کرنے کے لیے ادب کے ہر قاری کے لیے از حد زیادہ ضروری ہے کہ وہ یک نظر غالب میں چھپی ہوئی تہہ در تہہ صلاحیتوں کو دیکھ سکے ، جن کا ادراک نئے اور پرانے ناقدین نے ایک صدی کی انتھک جد و جہد کے بعد کیا ہے ۔ اس طرح یہ شمارہ غالب کے مطالعے کے نئے نئے گوشے اجاگر کرنے اور نئی نئی جہتوں کی تعیین کے لیے کلیدی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس تاریخی پیش کش کے سلسلے میں آپ کے ساتھی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

آفتاب احمد خان صاحب مشیر اقتصادیات پلاننگ بورڈ (کویت)

صحیفہ کے غالب نمبر کے دو حصے حال ہی میں کراچی سے خرید کر لایا تھا ۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ واقعی ان میں اُردو ادب کے اس مینار کو اس کے شایان شان عقیدت کا خراج پیش کیا گیا ہے ۔

مسعود گوہر بادوی صاحب (کراچی)

مجھے ''صحیفہ'' کا غالب نمبر ملا ۔ بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ۔ بلا مبالغہ برصغیر پاک و ہند سے اب تک جتنے غالب نمبر شائع ہوئے ہیں ، ان سب میں یہ بازی لے گیا ہے ۔ یوں تو ''صحیفہ'' کا ہر نمبر اعلیٰ معیار کا حامل ہوتا ہے لیکن یہ ''غالب نمبر'' واقعی عظیم شاعر کو زبردست خراج تحسین اور اردو ادب کا ایک لافانی شاہکار ہے ۔ آپ نے اپنے جریدے میں برصغیر کے تمام چوٹی کے ادیبوں ، محققوں ، تنقید نگاروں اور دانشوروں کے پُر مغز اور جامع مقالات شامل کیے ہیں ۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مقالہ اپنے موضوع پر ایک اچھوتا مقالہ ہے اور غالب کے خطوط پر اب تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ، ان میں

محاسن خطوط غالب سب پر فوقیت لے گیا ہے۔ غرض مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب پیش کش ہے جو آپ کے خلوص، محنت اور جگر کاوی کی مظہر ہے۔ میں آپ کو اور سب ساتھیوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

میں یہاں پر ''غالب پر ابوالکلام آزاد کا ایک مقالہ'' پر آپ کو متوجہ کروں گا۔ جناب عتیق صدیقی نے اس مقالے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اب تک مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالات کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں، وہ سب سیاسی یا مذہبی نوعیت کے ہیں اور کوئی ایک بھی ایسا مجموعہ نہیں شائع ہوا جس میں ان کے علمی و ادبی مقالات شامل ہوں۔ میرا خیال ہے، ان کی نظر سے ''مقالات آزاد'' نہیں گزری ہے جو قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ پیشتر لاہور میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں دو مقالے موجود ہیں؛ ایک غالب پر جو بجنسہ عتیق صاحب نے ''صحیفہ'' میں شائع کرایا ہے اور دوسرا عمر خیام سے متعلق ہے۔

نگارِ پاکستان

کا

غالب نمبر

مرزا نوشہ کی زندگی و شخصیت کا مستند صحیفہ اور
فکر و فن کا تحقیقی و تنقیدی مرقع

زیر ادارت: ڈاکٹر فرمان فتح پوری

قیمت: ۳ روپے

''نگارِ پاکستان''، ۳۲۔ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

"میری لائبریری" کے تحفے

غالب کی صد سالہ برسی پر

دیوان غالب اُردو (آفسٹ طباعت) : عرشی رامپوری کے تلفظ و اعراب کے مطابق مروج متن کو حسرت موہانی کے انتخاب ، حنیف رامے و عبدالرحمان چغتائی کی تصاویر کی نشان دہی ناقدین کی آرا کو مختلف عنوانوں کے تحت جمع کرکے بہترین لکھائی کے ساتھ :

میری لائبریری ۲/۲۵ روپے — با تصویر ، سفید کاغذ مجلد -/۵

مفہوم غالب : غالب کو سمجھنے کی کوشش بار بار ہو چکی ہے ۔ نواب احسن علی خان آف کنج پور کی مفہوم غالب تک رسائی کو غالب شناساؤں نے ایک کامیاب ترین کوشش مانا ہے ۔ مقدمہ از جسٹس ایس ۔ اے رحمان ، پیش لفظ از سید وزیر الحسن عابدی ۔ عمدہ طباعت

میری لائبریری -/۹ روپے مجلد سفید کاغذ -/۱۵ روپے

کلیات غالب فارسی : (غزلیات) سید وزیرالحسن عابدی نے تحقیقی و انتقادی اسلوب میں مرتب کیا ہے ۔ یہ ایک کتاب کئی کتابوں پر مشتمل ہے ۔ بڑی تقطیع $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ قریباً چھ سو صفحات

میری لائبریری میں -/۱۰ مجلد سفید کاغذ -/۲۰

انتخاب غالب : غالب کے خود نوشت سوانح ، مع قلمی تصویر لائق تحفہ ۔ عمدہ کاغذ ، عکسی بلاک طباعت -/۵۰

غالب دیاں غزلاں : اُردو کلام کا منظوم پنجابی ترجمہ مع متن ۔ جناب شہاب دہلوی کے مقدمے کے ساتھ مترجم پرنسپل دلشاد کلانچوی آفسٹ طباعت بہترین کتابت

میری لائبریری میں ۱/۵۰ سفید کاغذ ۳/۵۰

ہمارے ہول سیلرز : فیروز سنز لمیٹڈ اور دوسرے بک سیلرز سے طلب کریں

مکتبۂ میری لائبریری لاہور - ۲

مجلس ترقی ادب کی ایک اور لائق تحسین پیش کش

دیوان غالب

(نسخۂ حمیدیہ)

مفتی انوارالحق صاحب کے مرتب کردہ اولین نسخے کے بعد اب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے انتہائی صحت، کاوش، تحقیق اور مقدمے کے ساتھ اصل مخطوطے کے مطابق از سر نو مرتب کیا ہے۔ طباعت جدید ٹائپ اور دو رنگوں میں نہایت دلآویز، صورت اور سیرت کے اعتبار سے یہ نسخہ مجلس ترقی ادب کے کارہائے نمایاں میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

(زیر طبع)

مجلس ترقی ادب، ۲ کلب روڈ لاہور

مجلس ترقی ادب کی طرف سے غالب کو خراج عقیدت

دیوان غالب

(نسخۂ شیرانی)

مکمل فوٹو آفسٹ پرنٹنگ

قد آور کتابوں کے نوادرات میں ایک وقیع اضافہ

(زیر طبع)

مجلس ترقی ادب، ۲ کلب روڈ لاہور